ماہنامہ

کراچی

آنکھ مچولی

اس شمارے کے ساتھ ایک خوبصورت اسکیل کا تحفہ مُفت حاصل کریں۔

فروری سنہ ۱۹۹۰ء

احمد

آلو بخارے کی چٹنی

تازہ، خالص اجزاء۔ ذائقے کی شناخت

دسترخوان پر آلو بخارے کی چٹنی کھانے کا لطف دوبالا کر دیتی ہے۔
آلو بخارا ہاضمے کے لئے خصوصاً اور صحت کے لئے عموماً انتہائی مفید ہے۔
آلو بخارے کی چٹنی احمد کی اشیائے خوردنی میں نیا اور قابل قدر اضافہ
قدرت نے ذائقہ دیا — احمد نے محفوظ کیا

NATIONAL UF(SF)01/90

سب سے اچھی چیونگ گم   جوجو کی یہ ببل گم
لذّت کی لذّت
کھیل کا کھیل
Bubble Gum
گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

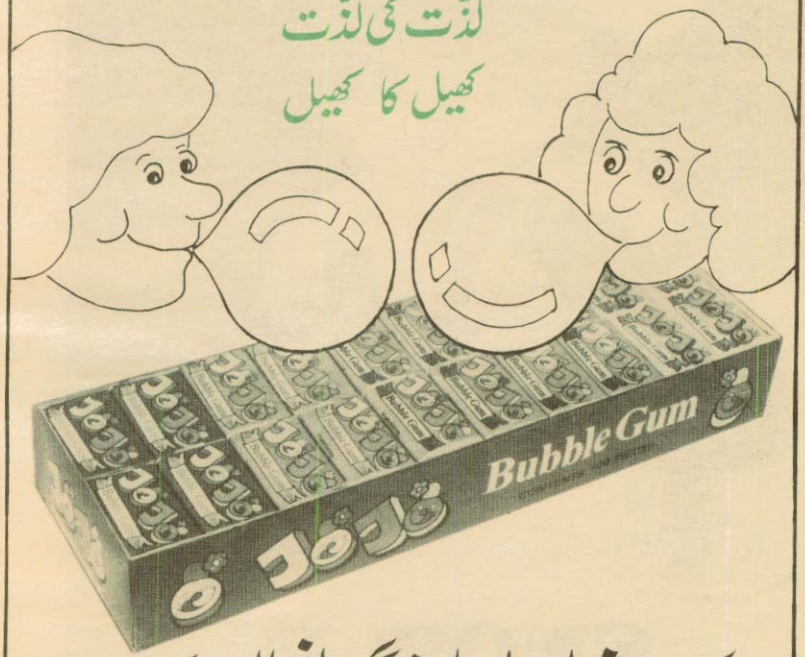

ABC آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

آنکھ مچولی

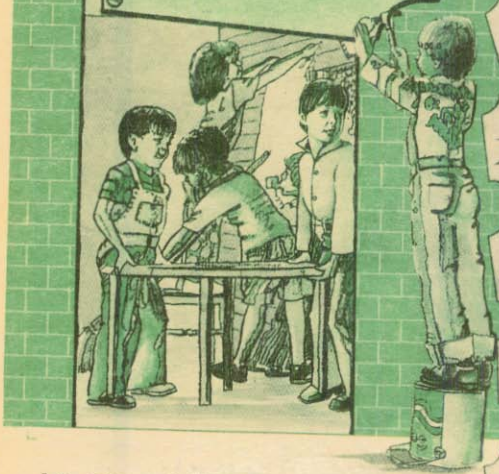

مُدیرِ اعلیٰ ظفر محمود شیخ

مُدیرِ مسئول تجمل حسین چشتی

مُشاورت مُشفق خواجہ ، امجد اسلام امجد

مُدیرانِ اعزازی طاہر مسعود ، محمد سلیم مغل

مجلسِ ادارت شاہ نواز فاروقی ، سیّد خورشید عالم

خَطّاطی عارف سعید

فون نمبر - ۲۹۹۱۷۸

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن وحدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں۔ کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

● ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیرِ سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کے لیے شائع کیا

جلد ۴ شمارہ ۸ فروری ۱۹۹۰ء رجب ۱۴۱۰ھ

قیمت ۱۰ روپے ، ۷ درہم ، ۷ ریال
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

ناشر ، ظفر محمود شیخ طابع ، زاہد علی مطبع ، لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ ۔ کراچی
خط و کتابت کا پتہ ؛ ماہنامہ آنکھ مچولی ، گرین گائیڈ اکیڈمی ، ۱۱۲۔ڈی ، نورس روڈ ، سائٹ کراچی

خصوصی بچت اسکیم

آنکھ مچولی کے ۱۲ شمارے کتنے سستے کتنے پیارے

۵۰ روپے کی خصوصی رعایت اور تحفہ مفت

آنکھ مچولی کے بارہ شماروں کی قیمت
مع دو خاص شمارے اور رجسٹرڈ ڈاک خرچ
۲۱۰ روپے بنتی ہے، لیکن سالانہ ممبر شپ حاصل کرنے والوں کے لیے خصوصی
رعایت یعنی ۲۱۰ کے بجائے صرف ۱۵۰ روپے۔ اس طرح گویا
مالی منفعت بھی اور علمی فائدہ بھی

آنکھ مچولی بیرونِ ملک منگوانے کے لئے زرِ سالانہ مبلغ ۳۰۰/- روپے

رسالہ سال بھر تک منگوانے کے لئے دو طریقوں میں سے جسے مناسب اور احسن سمجھیں اختیار کریں۔

① زرِ سالانہ کی رقم دفتر کے پتے پر منی آرڈر کریں اور کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں یا

② ۱۰ روپے کے ڈاک ٹکٹ اور صرف کوپن پُر کر کے ہمیں بھجوا دیں۔ ہم آپ کو پہلا رسالہ وی پی بھجوا دیں گے۔
آپ ۱۴۰ روپے کے عوض وی پی چھڑوالیں (کوپن صفحہ نمبر ۱۱۱ پر موجود ہے)

سالانہ ممبر شپ آنکھ مچولی ۱۱۲۔ ڈی سائٹ کراچی

نعت	شاہنواز فاروقی	۸
اداریہ		۹
ڈاکیا ڈاک لایا		۱۱
دو بھائی	نوید حمید	۱۵
دو آنسو	سلمان غزالی	۲۲
گاؤں کی ہوا (نظم)	شبیر بیگ	۲۷
چھوٹی چھوٹی باتیں	محمد عادل منہاج	۲۸
سچی خوشی	حنا خیری	۷۱
اسکول کا زمانہ (نظم)		۷۵
آیئے پین ہولڈر بنائیں	صالحہ ارشاد	۷۷
ایڈیٹر کی میز پر		۷۹
انسانی جسم ایک پیچیدہ دنیا	ساجد سعید	۸۴
غرور کا سر نیچا	شاہنواز فاروقی	۸۷
شعر میں شہر کا نام (نظم)	شان الحق حقی	۹۲
انجانی مہم	نعیم ساغر	۹۵
بدگمان	بنت یامین	۳۱
اگر ہم بے وزن ہو جائیں	سلمیٰ سلیم	۳۹
کھٹ مٹھے	(منتخب لطائف)	۴۱
جتنا گڑ اتنا میٹھا	محمد جاوید خالد	۴۵
سائنس انکوائری	سید ایاز محمود	۵۱
ضربِ مومن	طاہر مسعود	۵۵
پانی	تیر ابدالی	۶۷
احسان کا بدلہ	احسان اللہ احمد	۱۰۰
دھاڑیل	نعیم بجوچ	۱۰۳
آیئے علم جمع کریں	صباحت سلیم شیروانی	۱۱۱
انوکھا انتقام	نعمان طاہر شمسی	۱۱۵
یہ نیکی نہیں ہے	ذیشان بن صفدر	۱۱۹
ننھی نگارشات	منتخب تحریریں	۱۲۸
سالگرہ کے ساتھی	قلمی دوستی	۱۴۰
امی ابو کا صفحہ	ام ریمشا	۱۴۲

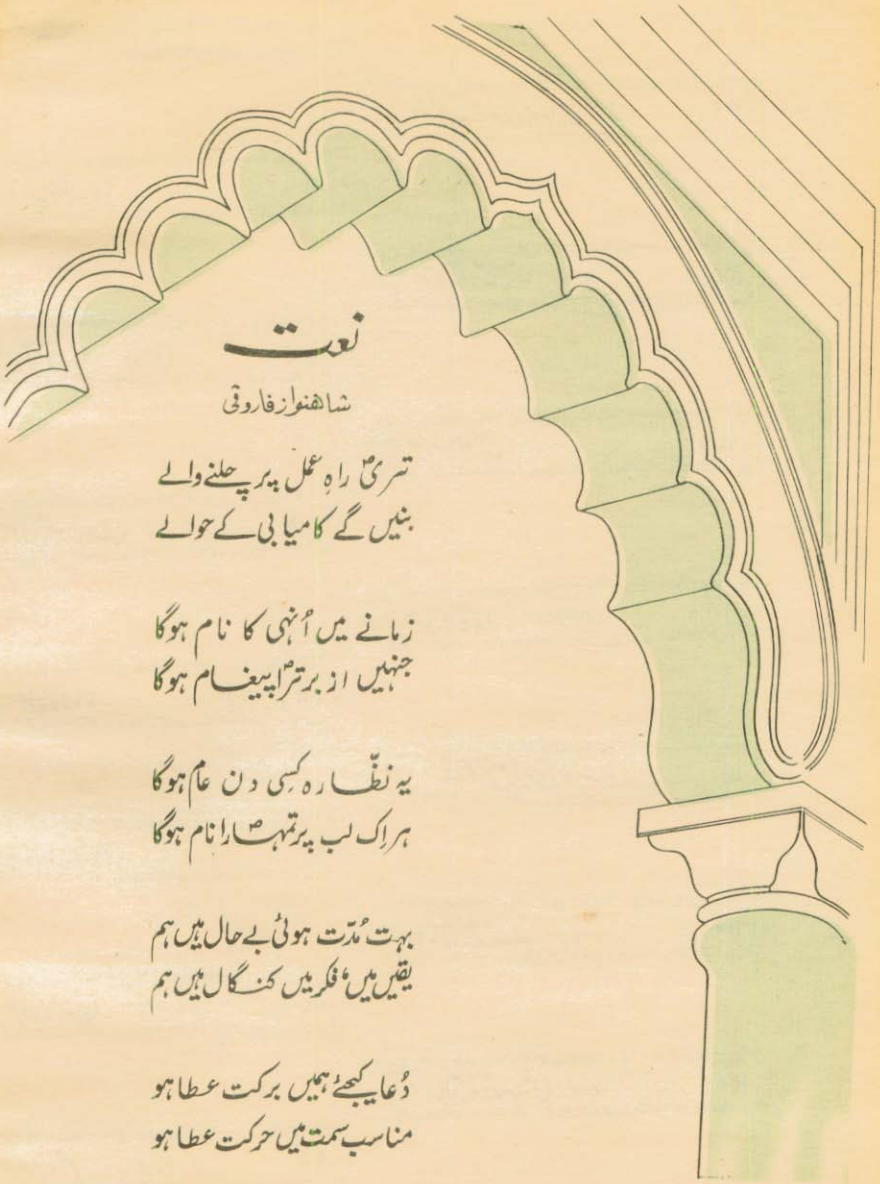

نعت

شاھنواز فاروقی

تری راہِ عمل پر چلنے والے
بنیں گے کامیابی کے حوالے

زمانے میں اُنہی کا نام ہوگا
جنہیں از بر ترا پیغام ہوگا

یہ نظّارہ کسی دن عام ہوگا
ہر اِک لب پر تمہارا نام ہوگا

بہت مُدّت ہوئی بے حال ہیں ہم
یقیں میں، فکر میں کنگال ہیں ہم

دُعا کیجئے ہمیں برکت عطا ہو
مناسب سمت میں حرکت عطا ہو

اداریہ

ماہِ رواں کی پہلی بات

آپ نے بے شمار بچوں کو دیکھا ہوگا جو محلے کے نکڑ پر، کسی وڈیو گیمز کی دکان پر یا دوستوں کی ٹولیوں کی صورت میں اکٹھے رہتے ہیں اور گھنٹوں کسی ایسے شغل میں مصروف رہتے ہیں جس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے بچوں کو دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ انھیں وقت کی قدر و قیمت کا کوئی احساس نہیں، ان کے سامنے کوئی واضح مقصد نہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُن میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا جذبہ بھی نہیں ہے۔ اس عمر میں اگر زندگی نظم و ضبط اور سلیقہ و شعور سے عاری ہو تو آئندہ کی زندگی بھی اسی ڈھب سے گزرتی ہے۔ جس میں بہتر مستقبل کے لئے نہ اُمنگ ہوتی ہے اور نہ محنت کرنے کی عادت۔

خُدا نے انسان کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ اس کی تخلیق کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کی قدر کرے، اُسے پہچانے اور اُسے ترقی دے کر دوسرے انسانوں اور معاشرے کے لئے فائدہ مند ثابت ہو۔ جب ہم ایسے بچوں کو دیکھتے ہیں جو اپنی صلاحیتوں سے بے خبر ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنی صلاحیتوں کو بھی برباد کر رہے ہیں تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوتا کہ ان کا مستقبل کوئی بہت تابناک نہیں ہوگا۔ وہ معمولی درجوں میں امتحانات پاس کر کے کوئی معمولی سی ملازمت کر لیں گے اور معاشرے میں ایک معمولی سے آدمی کے طور پر زندہ رہیں گے۔ ان کی تعلیم و تربیت ان کے خاندان اور عزیز و اقارب کے لئے تو کیا مفید ثابت ہوگی، خود وہ اس کی نعمتوں اور برکتوں سے محروم رہ جائیں گے۔ آپ غور کیجئے گا تو آپ کو اپنے گرد و پیش میں ایسے ان گنت لوگ نظر آجائیں گے جو آج کم حیثیت زندگی گزار رہے ہیں اور اسی بات پر افسردہ رہتے ہیں کہ انھوں نے ماضی میں اپنے وقت کا مفید استعمال کیوں نہیں کیا اور اپنے مستقبل کی فکر پہلے سے کیوں نہ کی۔ کیا ایسے لوگ آپ کے لئے قابلِ تقلید ہو سکتے ہیں؟ کیا ان کی زندگیوں میں آپ کے لئے کوئی سبق پوشیدہ نہیں ہے...؟ ذہین آدمی کی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ وہ دوسروں کی غلطیوں سے سیکھتا ہے۔ اور ابتدائی عمر کی غلطیاں تو بعض اوقات بڑی تباہ کُن ثابت ہوتی ہیں اور اُن کا اثر ساری زندگی رہتا ہے۔

کھیل کُود، سیر و تفریح، دوستوں سے میل ملاقات اور گپ شپ میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت کے لئے ضروری بھی ہیں لیکن مشاغل میں اعتدال ہونا چاہئے۔ اور یہ اعتدال اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ نظروں کے سامنے کوئی مقصد ہو۔ مثلاً یہ کہ آپ مستقبل میں کیا کرنا چاہتے ہیں، کیا بننا چاہتے ہیں؟ آپ جو بھی منصوبہ اپنے ذہن میں رکھتے ہوں، اُس کے لئے ابھی سے اپنے آپ کو تیار کرنا شروع کر دیں۔ اپنی تعلیمی اہلیت اور قابلیت میں اضافہ کریں۔ اپنا ایک نظام الاوقات بنائیں جس میں ہر کام کے لئے وقت مقرر ہو۔ اگر آپ یہ سب کچھ کرتے ہیں تو اس بات کی ضمانت دی جا سکتی ہے کہ آپ زندگی کی دوڑ میں کامیاب و کامران رہیں گے۔ اور آپ کو اپنے ماضی پر کبھی پچھتاوا نہیں ہوگا۔

آپ کا دوست

ظفر محمود شیخ

خوش نصیبی جن کے دروازوں پہ دستک دے گئی

حصولِ علم کے سفر کو آسان تر بنانے کے لئے

آنکھ مچولی نے دوسری بار جن چھ تعلیمی وظائف کا اعلان کیا تھا۔ اس میں ملک بھر کے ہزاروں طالبعلم ساتھی امیدوں کا دامن تھام کر شریک ہوئے۔

ہزاروں ناموں میں سے چھ خوش نصیبوں کے نام بذریعہ قرعہ اندازی حاصل کئے گئے

طالبات

۱۔ سمیرا ناز دُختر عبدالقدوس ۔ سرسید گورنمنٹ کالج ناظم آباد
۲۔ ذویا مریم رفیق ۔ سینٹ میریز گرلز ہائی اسکول گجرانوالہ
۳۔ زنیرا اکرام ۔ گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول ۔ دانیوال وہاڑی

طلبہ

۱۔ کاشف رضا، محمد رفیق رضا ۔ مکان نمبر ۸۲ گلی نمبر ۷، بکر محلہ ، لاہور کینٹ
۲۔ احمد فواد سعیدی ڈی ۔ ۱۰۲۰ سید پور روڈ سٹلائٹ ٹاؤن ۔ راولپنڈی
۳۔ گُل خان میر حاجی محمد ۔ برودلیج ، بلوچ ہاؤس پاکستان ہوٹل ملیر سٹی کراچی ۲۳

تمام خوش نصیب ساتھیوں کو ادارۂ آنکھ مچولی کی جانب سے دلی مبارکباد

اسکالرشپ حاصل کرنے والے طلبہ و طالبات سے گزارش ہے کہ وہ اپنے تعلیمی اداروں سے اپنے باقاعدہ طالب علم ہونے کا صداقت نامہ اور اپنا وہ پتا جس پر اسکالرشپ منگوانا مقصود ہو، صاف اور واضح لکھ کر ہمیں جلد از جلد بھجوادیں۔

آنکھ مچولی اسکالرشپ ، گرین گائیڈ اکیڈمی ۔ ڈی ۔ ۱۱۲ ۔ سائیٹ کراچی نمبر ۱۶

ایس ایم قریشی، حیدر آباد

جس طرح سندھ میں شاہ عبداللطیف اور لعل شہباز قلندر جیسے بزرگوں کے مزار ہیں اور پنجاب میں داتا گنج بخش اور میاں میر صاحب جیسے مشہور بزرگوں کے مزار ہیں۔ مجھے اب تک یہ نہیں معلوم کہ سرحد اور بلوچستان میں کن مشہور بزرگوں کے مزار ہیں۔ مہربانی کر کے مجھے ان مزاروں کے بارے میں جلد از جلد معلومات فراہم کرنے کی کوشش کیجئے۔

کیا آپ مزاروں کے بدلے میں کوئی تحقیقی مقالہ لکھ رہے ہیں؟ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر اس کے لئے آپ کسی مذہبی اسکالر سے رجوع کیجئے۔ اس سلسلے میں ہماری فراہم کردہ معلومات کچھ زیادہ مستند نہیں ہوں گی۔

شازیہ جمیل، کراچی

دسمبر کے شمارے میں "ماہ رواں کی پہلی بات" بے حد پسند آئی۔ ہمیں یقین ہے کہ ٹی وی کے منتظمین ان اہم اور غور طلب گزارشات پر دھیان دے کر ٹی وی کا معیار بلند کریں گے اور یہ اہم ادارہ ہم لوگوں کے لئے تربیت کا باعث بنے گا۔

ٹی وی ہمارا قومی ادارہ ہے۔ اور اس کے کردار پر اظہار خیال کرنا ہماری قومی ذمہ داری ہے۔ خدا کرے ٹی وی کی انتظامیہ بھی ان باتوں پر اسی طرح توجہ دے۔

عبدالسلام، اسلام آباد

آپ کے رسالے میں بہترین اور سبق آموز نصیحتیں، مزیدار لطیفے اور کہانیاں چھپتی ہیں جنہیں پڑھ کر لطف اندوز ہوا جاسکتا ہے۔ آپ کے ادارے کی ترقی کے لئے دعاگو ہوں۔

نسیم احمد ادیب، شاہ فیصل کالونی، کراچی

اس دفعہ "خوفناک نمبر" میں اتنی تاخیر کیوں ہوئی؟ جائیے معاف کیا۔ نقشِ ثانی، نقشِ اوّل سے بہتر ہوتا ہے۔ خوفناک نمبر ۲ پہلے سے لاکھ درجہ بہتر تھا۔ گوڈراؤنی کہانیاں پڑھ پڑھ کر پیٹ اب بھی نہیں بھرا اور میری خواہش ہے کہ خوفناک نمبر ۳ بھی چھاپا جائے جس کے صفحات پانچ سو اور قیمت بیس روپے ہو۔

خوفناک نمبر ۲ لانے میں واقعی دیر ہوگئی۔ وجہ یہ تھی کہ ادارہ آپ لوگوں کو ایک شاندار تحفہ دینا چاہتا تھا۔ مگر اس تحفے نے اتنا کام بڑھا دیا کہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں دیر سے پہنچا۔ خوفناک کہانیاں پڑھ پڑھ کر آپ لوگوں کا ڈر بھاگ چکا ہے۔ اس لئے اب ہم "بے خوف نمبر" لانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔

عظیم شمیم، کراچی، راجہ عرفان رزاق، کھاریاں، مدثر حسین، رحیم یار خان، زاہد غنی چوہان، ظفروال، محمد افتخار علی، کراچی، نسیم انور، ٹوبہ ٹیک سنگھ، شبیر احمد ناصر، صادق آباد محمد فیصل رشید، کراچی، عذرا ناز معیاد، کراچی، اکبر حسن بھٹی، وہاڑی، محمد یونس حسین، کراچی، محمد اعجاز خان بابر زئی، ضلع دادو، زرناب سبحانی، بورے والا، عمران بشیر، اسلام آباد،

خوفناک نمبر پڑھ کر نیند نہیں آئی۔ ایک ایک فقرہ دل میں اس طرح اُترا جیسے موت کے کنویں میں اُتر رہا ہو۔ کہانیاں بہت اچھی تھیں، کمزور دل رکھنے والے یقیناً پڑھ کر بے ہوش ہوگئے ہوں گے۔ تحفہ بہت شاندار تھا۔ اس سے بچوں کی معلومات میں بہت اضافہ ہوگا۔ پرچہ بہت تاخیر سے آیا۔ ہم لوگ بک اسٹالوں کا چکر لگاتے لگاتے تھک گئے۔ اور ہاں سرورق تو بہت ہی خوفناک تھا۔

اچھے دوستو! خوفناک نمبر ۲ کے ذریعے آپ لوگوں کی فرمائش پوری کی گئی۔ بچوں کے رسائل کی تاریخ میں یہ نہایت اچھوتے تجربات ہیں۔ اگر خوفناک نمبر، پڑھ کر آپ لوگ ڈر گئے ہیں تو یہ لکھنے والوں کی کامیابی ہے اور اگر نہیں ڈرے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ لوگ بہت بہادر ہیں۔ پرچہ دیر سے آنے کی وجہ اوپر بیان کر دی گئی ہے۔

صاحبزادہ عرفان سیف؟

میں آنکھ مچولی میں اپنا تعارف کرانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ صاحبان نے فروری کے مہینے میں میرا تعارف نہیں کرایا تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

تعارف چھپوانے کا ایک طریقہ ہے جو "سالگرہ کے ساتھی" میں درج ہے۔ آپ نے تو خط میں اپنے شہر تک کا نام نہیں لکھا ہے۔ بھلا اس طرح کہیں تعارف چھپتا ہے۔

فواد مظہر، سمن آباد لاہور

"خوفناک نمبر" میں نادیہ امتیاز کی کہانی "سمندر کے بھوت" نقل شدہ ہے۔ میری گزارش ہے کہ ان کا نام بلیک بکس میں لکھا جائے۔ اور آئندہ ان کی کوئی کہانی شائع نہ کی جائے۔

آپ کے بیان کی تحقیق کی جا رہی ہے اگر الزام درست ثابت ہوا تو بلیک بکس میں نام ضرور شائع کیا جائے گا۔

شوکت علی، کوٹ مومن

میں پراڈ آف پرفارمنس کی سند بنوانا چاہتا ہوں آپ بنا دیں گے یا نہیں

پراڈ آف پرفارمنس کی اسکیم بہت پہلے شروع کی گئی تھی، اب ختم ہو گئی۔

محمد انجم مبین، ڈیرہ اسماعیل خان

کارٹون کے پچھلے مقابلے میں میرے کارٹون کو دوسرے انعام کا حق دار ٹھہرایا گیا تھا لیکن آج تک میرا انعام نہیں ملا۔ کیا آپ صرف کہہ ہی دیتے ہیں یا عمل بھی کرتے ہیں۔

بھئی اگر انعام نہ دینا ہوتا تو اعلان ہی کیوں کرتے۔ کوئی مجبوری تو یقیناً نہیں تھی۔ ہاں البتہ انعام ملنے میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ آپ کا انعام آپ تک بہت جلد پہنچ جائے گا۔

محمد پرویز آرائیں، لاہور

بھائی جان! خوفناک نمبر کے ذریعے ہماری نیندیں اُڑا کر آپ تو پُرسکون نیند سو رہے ہوں گے۔ اتنا عجیب، پُراسرار، لرزہ خیز، خوفناک، ہولناک، حیرت انگیز اور دہشت ناک تحریروں اور تصاویروں والا "خوفناک نمبر" نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔ تحریروں کے ساتھ ساتھ تصاویر میں بھی آپ نے حد کر دی۔ چھوٹا بھائی تصویریں دیکھ کر اور بڑی باجی کہانیاں پڑھ کر اب تک اسکول اور کالج سے چھٹیاں کر رہے ہیں۔ رات بھر ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں اور کسی کو بھی سونے نہیں دیتے اور دن بھر روتے رہتے ہیں۔ ان کے علاوہ محلّے کے دس بچے بھی اسی حالت میں ہیں۔ لوگ کہتے ہیں ان پر جنّوں کا سایہ ہو گیا ہے اور میں کہتا ہوں کہ انھیں "خوفناک نمبر" ہو گیا ہے۔ ابھی تین کہانیاں ہی پڑھی ہیں کہ میری حالت بھی غیر ہونا شروع ہو گئی ہے راتوں کو نیند نہیں آتی اور ... اتنا کامیاب "خوفناک نمبر" نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد قبول کیجیے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے "خوفناک نمبر" کی تعریف کی ہے یا اس پر تنقید کی ہے۔ بہرحال جو بھی ہے تبصرہ بہت خوب ہے۔ آپ بھی اتنے خوفناک تبصرے کی مبارکباد قبول کیجیے۔

محمد وقاص علی، بہادر آباد، کراچی

میں نے آپ کو دو کہانیاں بھیجی تھیں مگر اس کا ابھی تک کوئی جواب نہیں ملا۔ کیا آپ صرف اپنے رشتہ داروں کی کہانیاں شائع کرتے ہیں؟

آپ کی کہانیاں نہیں چھپ سکیں تو اس کا مطلب یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ کی کہانیاں معیار پر پوری نہیں اُتریں اس کا آپ نے یہ مفہوم کیسے اخذ کر لیا کہ ہم صرف اپنے رشتہ داروں کی کہانیاں چھاپتے ہیں۔ ویسے مسلمان، پاکستانی اور انسان ہونے کے ناتے تو آپ بھی ہمارے رشتہ دار ہیں... کیوں انکار ہے آپ کو؟

دو بھائی

نوید حمید

چین کے کسی گاؤں میں دو بھائی رہتے تھے۔ موسم بہار میں بڑا بھائی ایک زمیندار کے پاس کام کرنے کے لئے پہنچا۔ زمیندار نے اس سے کہا کہ "میں بہت سخی آدمی ہوں۔ اپنے نوکروں کو دوسرے زمینداروں سے زیادہ مزدوری دیتا ہوں۔ میں تمہیں سال کے آخر میں نو ٹیل (چاندی کا ایک سکہ) دوں گا۔ لیکن یہاں کا ایک اصول ہے وہ یہ کہ میں تمہیں جو کام کرنے کو کہوں گا وہ تمہیں ہر صورت میں پورا کرنا ہو گا۔ اگر تم اسے پورا نہ کر سکے تو میں تمہارے تین ٹیل کاٹ لوں گا"۔

بڑا بھائی بہت محنتی تھا اسے کھیتوں میں کام کرنے کا تجربہ تھا۔ اور وہ ہر کام کر سکتا تھا۔ اس نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے زمیندار کی شرط مان لی اور اس کے پاس کام کرنے لگا۔

دس مہینے گزر گئے۔ وہ بڑی محنت سے اپنا کام کر رہا تھا اور اس نے زمیندار کو اپنے کام میں خرابی نکالنے کا موقع نہیں دیا تھا۔

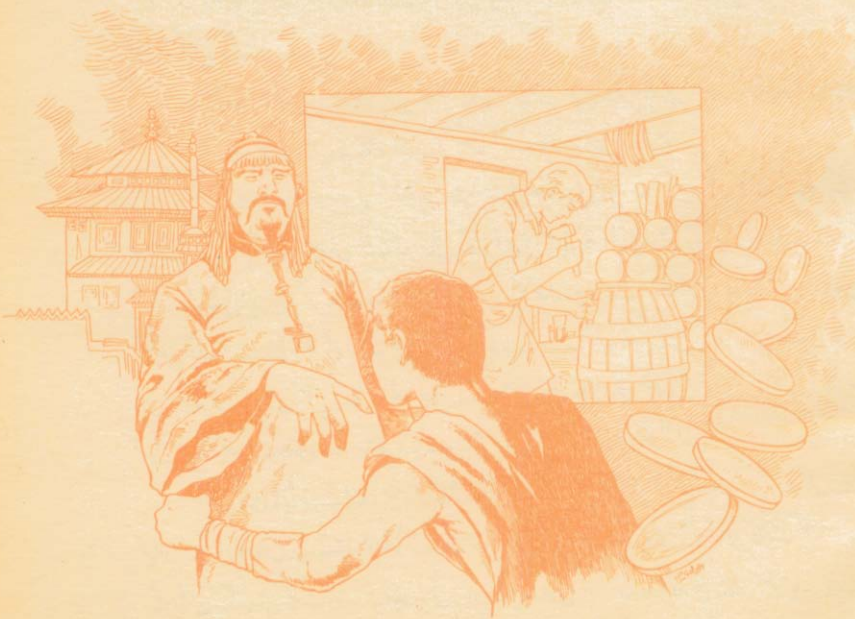

ایک دن جب وہ کھیت سے کاٹا ہوا اناج دھوپ میں سکھا رہا تھا تو زمیندار اس کے پاس آیا اور بولا! "اب سارا غلہ گودام میں جمع کر دینا چاہئے۔ لیکن سب سے پہلے تمہیں یہ کرنا ہو گا کہ گودام کے فرش کو دھوپ دے دو"۔

بڑا بھائی بہت حیران ہوا اور بولا "میں یہ کیسے کر سکتا ہوں؟ گودام پر چھت پڑی ہوئی ہے۔ سورج کی کرنیں اندر کیسے پہنچ سکیں گی۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے"؟ زمیندار مکاری سے مسکرایا۔

"ظاہر ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا" بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"بہت خوب" زمیندار مسکرایا "پھر تمہاری مزدوری میں سے تین ٹیل کاٹ لئے گئے"۔

پھر ایک دن اس نے بڑے بھائی کو باڑے کی صفائی کرنے کا حکم دیا۔ باڑے میں بہت سے چھوٹے بڑے ٹب پڑے ہوئے تھے جن میں وہ گرمیوں میں کنول کے پھول اگاتا تھا۔

"بڑے ٹبوں کو چھوٹے ٹبوں میں ڈال دو تاکہ اور جگہ نکل آئے"۔ اس نے بڑے بھائی سے کہا۔ بڑا بھائی بہت حیران ہوا اور بولا "میں کیسے کر سکتا ہوں؟ بڑے ٹب چھوٹے ٹبوں کے اندر کیسے آسکیں گے"۔

"تمہارا مطلب ہے کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے" زمیندار مکاری سے مسکرایا۔

"ظاہر ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا"۔ بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"بہت خوب! زمیندار مسکرایا "پھر تمہاری مزدوری میں سے تین ٹیل کاٹ دیئے گئے۔ بڑا بھائی مسلسل کام کرتا رہا یہاں تک کہ سال کے آخری مہینے کا آخری دن رہ گیا۔ ہر ایک نئے سال کا تہوار منانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ زمیندار اور اس کے خاندان والے بہت خوش تھے، لیکن بڑا بھائی بہت غمگین تھا۔ اسے سال بھر کی سخت مزدوری کے بدلے صرف تین ٹیل ملیں گے۔ اس نے سوچا "آج میں زمیندار سے تین ٹیل لے کر گھر جاؤں گا۔ اس سے چاول اور لکڑیاں خریدوں گا اور نئے سال کا تہوار اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ ابلے ہوئے چاول کھا کر مناؤں گا"۔

اس دن ناشتے کے بعد زمیندار نے اسے ایک بکرا ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس نے بکرے کو ذبح کیا اور اس کی بوٹیاں بنانے ہی والا تھا کہ زمیندار اس کے پاس آیا اور بولا "گوشت کا ایک ٹکڑا میرے سر کے وزن کے برابر کاٹ دو۔ نہ ایک رتّی زیادہ نہ ایک رتّی کم"۔ وہ مکاری سے مسکرایا۔ بڑے بھائی

نے احمقوں کی طرح اس کو دیکھا اور کہا "میں یہ کیسے کر سکتا ہوں" ؟

"تمہارا مطلب ہے کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے" ؟ زمیندار مسکرایا۔

"ظاہر ہے کہ میں یہ کام نہیں کر سکتا" ۔ بڑے بھائی نے جواب دیا۔

"بہت خوب ! پھر تمہاری مزدوری میں سے باقی تین ٹیل بھی کاٹ لئے گئے۔ حساب برابر ہو گیا۔ اب میرے ذمے تمہارا کوئی پیسا نہیں" ۔ زمیندار مکاری سے ہنسا۔ بڑا بھائی افسردہ ہو کر اپنے گھر پہنچا اور چھوٹے بھائی کو سارا واقعہ سنایا۔ چھوٹے بھائی نے اسے دلاسا دیا اور اس کی ہمت بندھائی۔

نئے سال کے تہوار پر لوگوں نے دل کھول کر خوشیاں منائیں لیکن دونوں غریب بھائیوں کو پیٹ بھرنے کے لئے چاول اور سردی سے بچنے کے لئے لکڑیاں تک نصیب نہ ہوئیں۔

چند دنوں کے بعد چھوٹا بھائی اسی زمیندار کے پاس کام کرنے لئے پہنچا۔ زمیندار نے اس سے کہا! "میں بہت سخی آدمی ہوں۔ میں اپنے ملازموں کو دوسرے زمینداروں کے مقابلے میں زیادہ اجرت دیتا ہوں۔ میں تمہیں سال کے آخر میں نو ٹیل دوں گا لیکن یہاں کا ایک اصول ہے اور وہ یہ کہ میں تمہیں جو کام کرنے کو کہوں گا وہ تمہیں ہر صورت میں پورا کرنا ہو گا۔ اگر تم اسے پورا نہیں کر سکو گے تو میں تمہارے تین ٹیل کاٹ لوں گا" ۔

"منظور ہے" چھوٹے بھائی نے جواب دیا اور بولا "لیکن جب میں کہیں کام کرتا ہوں تو میرا بھی ایک اصول ہوتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر میرا مالک کسی کام کا حکم دے کر اسے واپس لے لے تو اسے دوگنی مزدوری دینی پڑے گی۔

زمیندار چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا! "ٹھیک ہے مجھے تمہاری شرط منظور ہے" ۔

دس مہینے گزر گئے، وہ بڑی محنت سے کام کر رہا تھا۔

ایک دن جب وہ کھیت کا کاٹا ہوا اناج دھوپ میں سکھا رہا تھا تو اس کے پاس زمیندار اپنی پرانی چال چلنے کے لئے آیا۔

"اب تم سارا غلہ گودام میں رکھ دو" اس نے کہا "لیکن سب سے پہلے تمہیں گودام کے فرش کو دھوپ دینا ہوگی" ۔ چھوٹا بھائی کچھ دیر سوچتا رہا کیونکہ گودام کے اوپر بڑی چھت پڑی ہوئی تھی۔ آخر چھوٹے بھائی ہتھوڑا اٹھایا اور چھت پر چڑھ کر چھت کو توڑنے لگا۔ زمیندار نے گھبرا کر کہا "یہ کیا کرتے ہو؟"

چھوٹے بھائی نے مسکرا کر کہا کہ "میں تو دھوپ کے لئے جگہ بنا رہا ہوں تاکہ گودام کے فرش کو دھوپ مل سکے" ۔

زمیندار نے کہا "نہیں، نہیں میں اپنا حکم واپس لیتا ہوں" ۔

چھوٹا بھائی مسکرا کر بولا "تو پھر چھ ٹیل میرے ہوگئے"

پھر ایک دن اس نے چھوٹے بھائی سے کہا "باڑے کو صاف کر دو" ۔ اور بڑے ٹبوں کو چھوٹے ٹبوں کے اندر ڈال دو" ۔ زمیندار نے کہا۔

چھوٹے بھائی نے بڑے ٹبوں کو توڑ کر چھوٹے ٹبوں میں ڈالنا شروع کر دیا۔ زمیندار گھبرا کر بولا "ارے، ارے یہ کیا کر رہے ہو؟"

"میں تو بڑے ٹبوں کو چھوٹے ٹبوں کے اندر داخل کر رہا ہوں" چھوٹے بھائی نے جواب دیا۔

زمیندار نے کہا "نہیں، نہیں میں اپنا حکم واپس لیتا ہوں" ۔

"تو پھر میرے چھ ٹیل پکے ہوگئے۔ چھوٹے بھائی نے کہا۔

آخر سال کے آخری مہینے کے آخری دن زمیندار نے چھوٹے بھائی سے کہا "کہ وہ بکرا ذبح کرے اور گوشت کا ایک ٹکڑا میرے سر کے وزن کے برابر کاٹ دینا نہ ایک رتی کم اور نہ ایک رتی زیادہ" ۔ زمیندار مکاری سے مسکرایا۔

چھوٹے بھائی بکرے کو ذبح کر کے چھری کو لیکر زمیندرا کے اوپر چڑھ بیٹھا۔

"ارے یہ کیا کرتے ہو؟" زمیندار نے گھبرا کر پوچھا۔

"تمہارا سر کاٹ رہا ہوں تاکہ وزن کر کے اسی کے برابر گوشت کا ٹکڑا کاٹ دوں۔ اور تمہیں دے دوں" ۔ چھوٹے بھائی نے کہا۔

زمیندار نے گھبرا کر کہا کہ "میں اپنا حکم واپس لیتا ہوں" ۔ چھوٹے بھائی نے اس سے کہا "چھ ٹیل میرے ہوگئے۔ اور اس طرح پورے اٹھارہ ٹیل بنتے ہیں سو وہ جلد نکالو" ۔

زمیندار مردہ قدموں سے اٹھا اور بکس سے اسے اٹھارہ ٹیل نکال کر دیئے۔ اور مردہ سی آواز میں بولا۔ "لو اپنے اٹھارہ ٹیل۔ اب میرا تمہارے اوپر کوئی ٹیل نہیں ہے۔ لہٰذا تم جا سکتے ہو۔" اور زمیندار نے ایسی چال بازی سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔ اور پھر چھوٹا بھائی خوشی خوشی گھر آیا اور نو ٹیل بڑے بھائی کو دے دیئے۔ پھر دونوں بھائیوں نے نئے سال کا تہوار بڑی دھوم دھام سے منایا۔

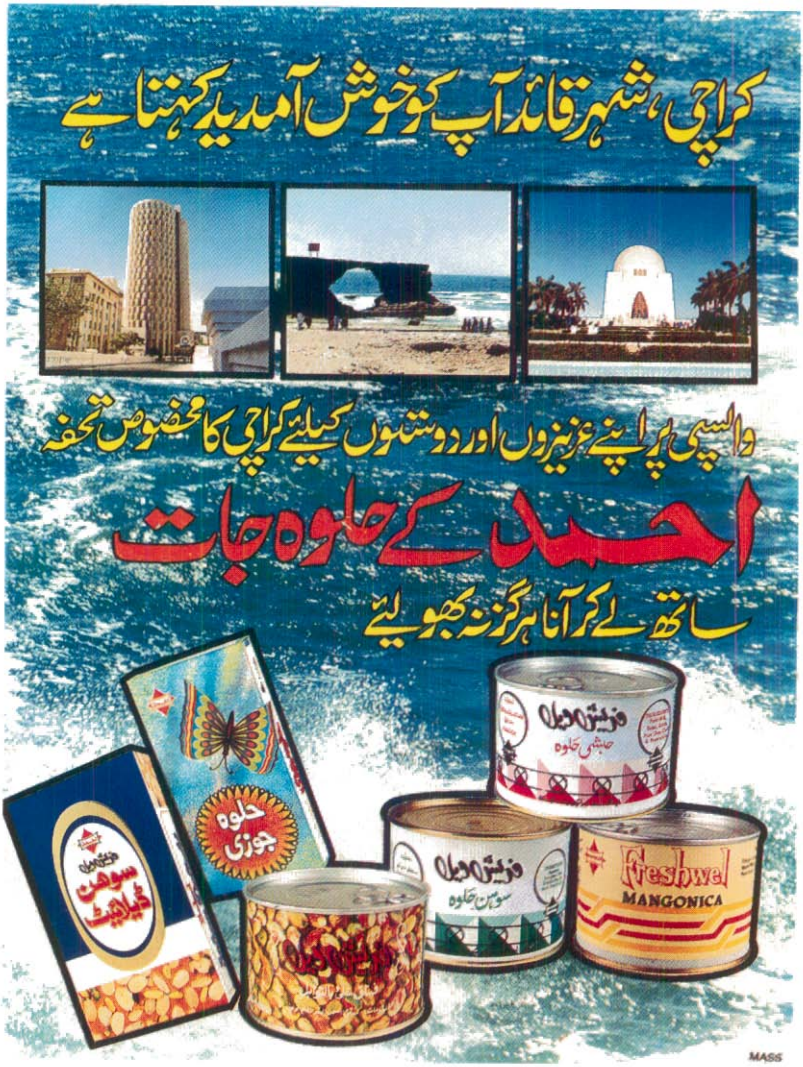

کراچی، شہر قائد آپ کو خوش آمدید کہتا ہے
واپسی پر اپنے عزیزوں اور دوستوں کیلئے کراچی کا مخصوص تحفہ
احمد کے حلوہ جات
ساتھ لے کر آنا ہرگز نہ بھولیئے
حلوہ جوزی
سوہن ڈیلائیٹ
حبشی حلوہ
سوہن حلوہ
Freshwel
MANGONICA

MASS

دھوپ نکلی تو آگیا کچھ ہوش ورنہ بے ہوش تھے میاں خرگوش

② اس قدر سرد ہوگیا پانی
یاد آنے لگی مجھے نانی

③ سفید وہیلیں
قطب شمالی کی کہہ رہی ہیں
یہ دوستوں سے
کہ آؤ کھیلیں

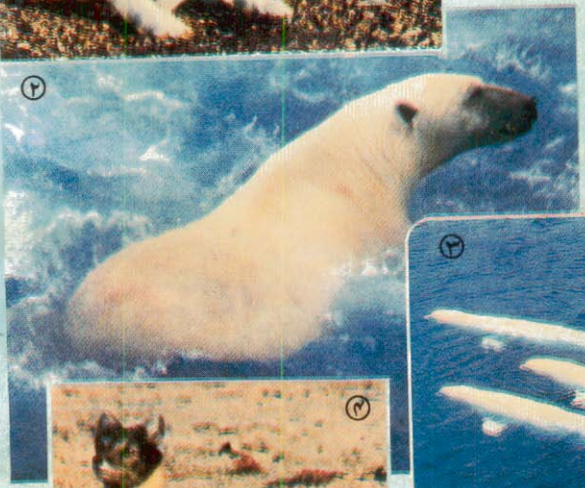

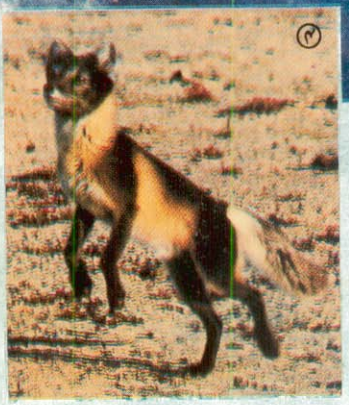

④ قطب شمالی کی لومڑی جی !
شکار کے انتظار میں ہیں

قطب شمالی کی سرزمیں پر

جنید شمیم

دنیا کے نقشے کے ٹھیک اوپر سال کے اکثر مہینوں میں ہر چیز برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ حتّٰی کہ یہاں سمندر بھی مارے سردی کے جم جاتا ہے۔ یہاں پر ہماری زمین کے اور خطوں کی طرح درخت نہیں اُگ سکتے۔ اگر آپ کبھی یہاں جائیں گے تو ہر وقت جسم کو کاٹ کر رکھ دینے والی تیز سرد ہوائیں آپ کے استقبال کو موجود ہوں گی۔ اس لئے اگر آپ کبھی اس خطّے کو قدم بوسی کی زحمت دیں تو لنڈا بازار سے دو چار کوٹ اور موٹے موٹے کمبل لے جانا مت بھولئے گا۔

قطب شمالی کی سردیاں سات سے آٹھ ماہ تک رہتی ہیں۔ اس زمانے میں یہاں کا درجۂ حرارت منفی ۴۶ سینٹی گریڈ ہو جاتا ہے (یہیں یہ لکھتے ہوئے جھرجھری آئی ہے تو آپ کو یقیناً پڑھتے ہوئے جھرجھری آئی ہوگی۔) گرمی کے مختصر سے وقفہ میں قطب شمالی پر جمی ہوئی کچھ برف پگھلتی ہے جس کے نتیجہ میں برفانی علاقوں کے پھول کھل اُٹھتے ہیں مگر جناب گرمی میں بھی یہاں کی زمین پانچ سے چھ فٹ موٹی تہہ والی برف کے نیچے چھپی رہتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ایسے خطّے میں رہنے والے حیوانات بھلا کیسے زندہ رہتے ہوں گے؟ آپ ہی بتائیے۔ ہمارا مطلب ہے ذاتی تجربے کی مدد سے نہیں، اپنے خیال کی مدد سے۔ جناب آپ کو مشکل ہو رہی ہے تو ہم بتلائے دیتے ہیں۔ ہمارا مطلب ہے اپنے خیال کی مدد سے۔

جناب اللہ میاں جو ہیں نا وہ بڑے مہربان ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ہی ان جانوروں میں یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ اس سرد ماحول میں زندہ رہیں۔ اب دیکھئے نا اس خطّے کے جانوروں کے کان پیدائشی طور پر چھوٹے ہوتے ہیں جس کے باعث ان کے جسم اپنے اندر زیادہ حرارت کو محفوظ رکھ کر سردی سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں کے جانوروں پر بال نہ صرف یہ کہ بڑے ہوتے ہیں بلکہ گھنے بھی ہوتے ہیں۔

اسی طرح پانی میں رہنے والے جانور بھی کچھ ایسی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں جو اُنہیں سردی سے محفوظ رکھتی ہیں۔ مثلاً قطب شمالی کی وہیل کے پیٹ کے ٹھیک نیچے چربی کی ایک بہت موٹی تہہ ہوتی ہے جو اُسے سرد موسم کے شدید اثرات سے محفوظ رکھتی ہے۔ یہ وہیل مچھلیاں اپنی دُموں سے برف کی چھوٹی چھوٹی تہہ کو توڑ کر آگے بڑھنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ اسی طرح قطب شمالی کی لومڑی برفباری کے وقت اپنی نرم ملائم اور بالوں سے بھری ہوئی دُم کو اپنی ناک پر رکھ کر بیٹھ جاتی ہے جس کے باعث وہ سرد ہواؤں کے اثرات سے محفوظ ہو جاتی ہے۔ قطب شمالی کے بہت سے چوپائے سرد موسم میں سفید بالوں سے ڈھک جاتے ہیں۔ یہ سفید بال انہیں برف کی رنگت کا بنا کر انہیں اُن کے دشمنوں سے محفوظ رکھتے ہیں۔

آپ نے دیکھا اللہ تعالیٰ اپنی حقیر سے حقیر مخلوق کو بھی کس طرح محفوظ رکھتا ہے۔ ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ہم انسان جو اشرف المخلوقات میں کہیں اسی لئے تو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا نہیں کہ ہم خدا کے حد سے زیادہ نافرمان ہو گئے ہیں۔ بھئی غور کرنے میں کیا جاتا ہے؟

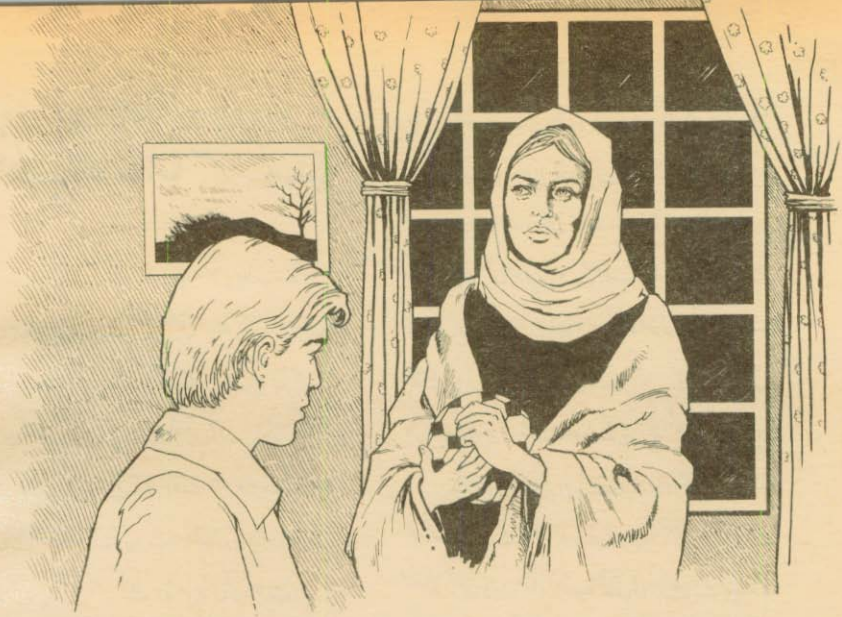

دو آنسو

سلمان غزالی

مجھے تو اُس اُدھیڑ عمر عورت پر اُسی دن سے شک ہو گیا تھا۔ جب وہ پہلی دفعہ ہمارے گھر آئی تھی۔ میلے کچیلے بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس، پاؤں میں پُرانی گھسی ہوئی چپّل جس کا رنگ تو ماند پڑ ہی چکا تھا۔ جگہ جگہ سلائی کھُل جانے کی وجہ سے وہ اپنی اصل شکل بھی کھو چکی تھی۔ سر پر موجود پتلی سی اوڑھنی کے سوراخوں میں سے اُس کے اُلجھے ہوئے بال جھانک رہے تھے جن میں وقت سے پہلے سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ چہرے پر اُداسی اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔

وہ مجھے پہلی نظر ہی میں اچھی نہ لگی۔ ویسے بھی ایسے چھوٹے اور غریب لوگ بھیک مانگنے اور چوری کرنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ جب میں اسکول سے لوٹا تو سیٹنگ روم میں وہ امّی کے سامنے سر جھکائے کھڑی تھی۔ نہ جانے اُس نے امّی کو اپنی کیسی دُکھ بھری داستان سُنائی کہ امّی رو پڑیں۔ میں صرف اتنا سُن سکا کہ وہ دنیا میں اکیلی تھی۔ اُس کی واحد جھونپڑی جل چکی تھی۔ اور اب وہ بالکل بے سہارا تھی۔ امّی نے نہ صرف اُسے گھر پر ملازم رکھ لیا بلکہ سرونٹ کوارٹر کا ایک کمرہ بھی دے دیا۔

مجھے یہ بات بہت بُری لگی۔ مجھے ایسے گندے اور غریب لوگ نہ اچھے لگتے تھے اور نہ مجھے اُن پر اعتبار تھا۔

ہر آدمی مجھے چور لگتا تھا۔ یہ سوچ میری گھریلو تربیت کا نتیجہ نہ تھی بلکہ اُس اُونچی سوسائٹی کی دی ہوئی تھی جس کا میں فرد تھا اور عمر میں ابھی چھوٹا ہونے کے باوجود میں کافی شکی اور تلخ مزاج تھا۔ میں نے امّی کو ایسا کرنے سے روکنا بھی چاہا مگر امّی ابّو کا چہیتا اور لاڈلا ہونے کے باوجود ابھی میں اتنا بڑا نہ تھا کہ ایسے معاملے میں میری بات مانی جاتی۔

اپنے اچھے کام سے اُس نے جلد ہی امّی کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ مگر میرا شک اپنی جگہ پر تھا۔ بلکہ اُس کے عجیب و غریب رویّے سے میرا شک اور پختہ ہو گیا تھا۔ ایک کمرے کی صفائی میں وہ گھنٹہ گھنٹہ لگا دیتی۔ ایک ایک چیز کو دیر تک رگڑ رگڑ کر صاف کرتی اور بالکل آئینے کی مانند چمکا دیتی۔ بھلا ملازموں نے بھی ایسے کام کیا ہے۔ ضرورت کچھ اُڑانے کے چکّر میں ہے جو گھنٹوں کمرے کی صفائی میں لگا دیتی ہے۔ اور خصوصاً میرے کمرے کی تو وہ ایک ایک چیز کو یوں لگن سے صاف کرتی جیسے میری نہیں اُس کی چیز ہو۔ میں سوچتا یہ ضرور امّی ابّو سے ڈرتی ہے اس لئے اُن کے بجائے میرے کمرے سے موقع ملنے پر کچھ اُٹھانا چاہتی ہے۔ پھر میرے کمرے میں ایسی بہت سی قیمتی چیزیں موجود تھیں جن پر اُس کی نظر ہو سکتی تھی۔ میرے کھلونوں اور کمرے کی تمام اشیاء کو وہ بڑی عجیب نظروں سے دیکھتی تھی اور جب وہ اپنی بجھی بجھی سی نظروں سے مجھے دیکھتی تو اُس کی آنکھوں میں ایسی چمک پیدا ہو جاتی جیسے کسی بیش بہا خزانے پر نظر پڑنے سے انسان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی ہیں۔ وہ میری طرف یوں دیکھتی رہتی جیسے مجھے اپنی آنکھوں میں سمو لے گی۔ اُس کی نظروں کا اصل مفہوم تو میں سمجھنے سے قاصر تھا مگر جو شک ایک دفعہ میرے دل میں بیٹھ گیا تھا اُس کی ہر نظر ہر عمل اُسی شک کو تقویت بخشتا۔ میں اکثر امّی سے کہتا۔

"امّی! اس کو نکال دیں یہ مجھے چور لگتی ہے۔"

"بُری بات ہے بیٹا! وہ تمہاری ماں جیسی ہے ایسی بات نہیں کرتے۔" امّی مجھے سمجھاتیں۔

"امّی! میں سچ کہتا ہوں یہ ضرور کسی دن کوئی قیمتی چیز چُرا لے گی۔"

"حسن! تمہیں منع کیا ہے ناں ایسی باتیں کرنے سے۔ بھلا اُس بیچاری نے تمہاری کوئی چیز چُرائی ہے جو تم یوں کہتے ہو۔" امّی کے لہجے میں ہلکی سی سختی آجاتی۔

"چوری نہیں کی تو کیا ہوا، کسی دن ایک ہی دفعہ ڈاکہ ڈلوا دے گی گھر میں۔ ایسے ملازم ایسا ہی کرتے ہیں۔" ایک دن میں نے بڑے تلخ لہجے میں کہا۔ آگے سے امّی نے مجھے ڈانٹ دیا۔ مجھے بہت دُکھ ہُوا اور میرا شک ختم ہونے کے بجائے مجھے اُس سے نفرت سی ہو گئی۔ اب وہ جتنی دیر جھاڑ پونچھ اور صفائی کرتی میں اُس کے ساتھ رہتا۔ تاکہ اُسے کوئی چیز چُرانے کا موقع نہ مل سکے۔ وہ کام صبح کے وقت ختم کر لیتی تھی۔ میں چونکہ دوپہر کی شفٹ میں اسکول جاتا تھا اس لئے سارا وقت اُس کی نگرانی کرتا رہتا۔ وہ بھی یہ بات محسوس کرنے لگی تھی مگر خاموش رہتی اور جب بھی میری طرف دیکھتی

پیار بھری نظر سے دیکھتی۔۔

"اس میں بھی اس کی ضرور کوئی غرض پوشیدہ ہوگی"۔ میں سوچتا اور مجھے اُس سے اور نفرت ہونے لگتی۔ ایک دن میں صبح باغ میں ٹہل رہا تھا کہ اچانک میری نظر گھڑی پر پڑی تو میں چونک پڑا "ارے اُس نے میرے کمرے کی صفائی بھی شروع کر دی ہوگی اور آج تو امّی بھی گھر پر نہیں ہیں" میرے منہ سے نکلا اور میں تیزی سے اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ جونہی میں نے دروازے میں قدم رکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ میری تصویر ہاتھ میں پکڑے بہت قریب سے دیکھ رہی ہے۔ تصویر جس فریم میں لگی ہوئی تھی وہ سونے کا تھا اور اُس کی قیمت دو تین ہزار روپے ہوگی۔ ہَوا سے اُس کی چادر بار بار پھڑپھڑاتی اور ہر دوسرے لمحے فریم چھُپ جاتا۔ مجھے دیکھ کر وہ گھبرا گئی ایسے جیسے اُس کی چوری پکڑی گئی ہو گھبراہٹ میں فریم اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔

"مم۔۔ معاف کرنا شان بیٹے!" یہ کہتے ہوئے اُس نے فریم اُٹھایا اور جلدی جلدی اُسے صاف کرنے لگی۔ اُس کی اس حرکت سے تو مجھے پورا یقین ہوگیا کہ اُس کی نیت ٹھیک نہیں۔

جس طرح وہ فریم کو اتنا قریب لے جا کر دیکھ رہی تھی یقیناً وہ اسے چادر میں چھپانا چاہتی تھی کہ میں پہنچ گیا اور گھبراہٹ میں اُس کے ہاتھ سے تصویر نیچے گر گئی اُس دن امّی بھی گھر پر نہیں تھیں اور میں بھی باغ میں تھا۔ اس لحاظ سے یہ اُس کے لئے بہترین موقع تھا۔ میرے اس خیال نے اُسے میری نظروں میں اور گرا دیا۔ پہلے تو مجھے اس کی ظاہری حالت اور رویہ دیکھ کر شک تھا کہ کہیں وہ کچھ چرا نہ لے مگر اب تو وہ مجھے پوری چور دکھائی دینے لگی تھی۔ امّی بازار سے لوٹیں تو میں نے ایک دفعہ پھر امّی سے اس موضوع پر بات کی کیونکہ مجھے پورا یقین تھا کہ آج میری بات سننے کے بعد اُسے گھر سے نکال دیں گی۔ مگر امّی نے اس دفعہ بھی مجھے سختی سے ڈانٹ دیا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی نہ جانے اُس نے امّی پر کیا جادو کر دیا تھا کہ امّی اُس کے خلاف کوئی بات نہیں سنتی تھیں۔ اُس دن مجھے بہت غصہ آیا اور میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ اسے رنگے ہاتھوں پکڑوں گا۔ اب میں نے چھپ چھپ کر اُس کی نگرانی شروع کر دی۔ کافی دن گزر گئے مگر اُس نے کچھ چرانے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کوئی چیز غائب ہوئی۔ البتہ اُس کا رویہ اور انداز اب بھی ویسا ہی تھا۔ وہ کام بھی ویسے ہی کرتی۔ اُسی انداز سے میری طرف دیکھتی۔ یہ حالات میرے لئے بڑے پریشان کُن تھے۔ "آخر وہ کچھ چوری کیوں نہیں کرتی؟" یہ سوال مجھے بار بار پریشان کرتا، پھر ایک دن میری یہ اُلجھن بھی رفع ہوگئی۔ مجھ پر بڑا سنسنی خیز انکشاف ہوا تھا! اب مجھے اس کا اصل مقصد سمجھ میں آگیا تھا۔ اسکول میں میرے دوست کاشف نے مجھے بتایا کہ اُس کی آیا اُس سے بڑا پیار کرتی تھی۔ وہ بھی آیا سے بہت مانوس ہوگیا تھا اور اکثر اُس کے ساتھ پارک میں کھیلنے یا گھومنے پھرنے چلا جاتا تھا۔ ایک دفعہ آیا اُسے پارک سے ملحقہ ایک گندی سنسان گلی میں لے

گئی۔ جہاں ایک آدمی پہلے سے موجود تھا۔ انہوں نے مجھے اغوا کرنا چاہا۔ مگر اتفاق سے عین موقع پر وہاں کچھ لوگ آ گئے۔ اور آیا اور وہ آدمی پکڑے گئے۔ یہ سنتے ہی جیسے تمام بات میری سمجھ میں آ گئی کہ وہ کیوں مجھ سے اتنا پیار جتاتی تھی۔ میرے نگرانی کرنے پر بھی ایک حرف زبان پر نہ لاتی تھی اور میرے سخت رویے کے باوجود اُس کی زبان کا شان بابو ۔۔۔ چھوٹے صاحب ۔۔۔ کہتے نہ تھکتی تھی۔ وہ یقیناً چھوٹی موٹی چیز مثلاً چرانے کے بجائے ایک ہی دفعہ مجھے کیش کرانا چاہتی تھی گویا میرا شک صحیح تھا بلکہ وہ تو میرے خیال سے بڑی چوری کرنا چاہتی تھی۔ اب تو میں اور بھی محتاط ہو گیا۔ میرا رویہ اب اور زیادہ سخت ہو گیا تھا۔ میں کسی بھی مقام پر اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک دن کام کرتے ہوئے اُس کے ہاتھ سے جھاڑن نیچے گر گیا۔ جھاڑن میرے قدموں میں آ کر گرا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے جھاڑن اُٹھا کر اُس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر اپنی میلی چادر میں چھپا لے گی اور پھر کہیں بھاگ جائے گی۔ میں ایک دم پیچھے ہو گیا۔ اُس کے کھلے بازو لہرا کر رہ گئے۔ اُس کا چہرہ یکایک تاریک ہو گیا۔ اور آنکھیں پھر ویران ہو گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ ابھی رو دے گی۔ میرے سامنے تو اُس کی آنکھیں نہیں چھلکیں مگر وہ بعد میں ضرور روئی ہو گی۔ کیونکہ میں نے اس کی آنکھوں میں ایسے بادل دیکھے تھے جو برسے بغیر نہیں ٹلتے۔

اُس دن مجھ پر عجیب سی کیفیت طاری رہی۔ میں نے خود کو سمجھانے کی بہت کوشش کی وہ سب ڈھونگ تھا۔ اُس کے منصوبے کا ایک حصّہ تھا۔ مگر دل نہ مانا۔ میں نے اُس کے لئے اپنے دل میں عجیب سا جذبہ محسوس کیا۔ اتنے عرصے تک نفرت اور دشمنی کرنے کے بعد ایک دم سے مجھے اُس سے ہمدردی سی محسوس ہوئی۔ میں خود اس بات پر حیران تھا۔ مگر دوسرے ہی دن بھاپ کی مانند اُڑ گیا۔ اور میرا دل اُس کے خلاف پھر نفرت سے بھر گیا جب وہ چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔

ہُوا یوں کہ میں بہت دنوں سے فٹ بال لانے کی ضد کر رہا تھا۔ پچھلی شام ابّو نے مجھے چھوٹا فٹ بال لا دیا۔ فٹبال دیکھ کر میں بہت خوش ہوا۔ میں اُسے سرہانے رکھ کر سو گیا۔ صبح اُٹھا تو فٹ بال غائب تھا۔ میں فٹ بال ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے ٹی وی لاؤنج میں آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اپنی اسی میلی کچیلی چادر میں کچھ چھپا کر لے جا رہی ہے۔ میں نے لپک کر چادر کا کونہ پکڑ لیا اور زور سے کھینچا۔ دوسرا سرا اُس کے ہاتھ میں تھا۔ نتیجتاً بوسیدہ چادر بیچ سے پھٹ گئی اور فٹ بال ۔۔۔ میرا نیا فٹ بال نکل کر یوں فرش پر لڑھک گیا جیسے وہ فرار حاصل کرنے کے لئے سخت بے چین ہو۔ میں حیران رہ گیا۔ کتنی معمولی چیز چوری کی تھی۔ اس سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ غصّہ بھی آ رہا تھا۔ غصّے میں میں نے اُسے بُرا بھلا کہا۔ اُس کا رنگ بالکل فق ہو گیا تھا اور حالت ایسی تھی جیسے ابھی ابھی سزائے موت

سُنائی گئی ہو۔ میں کہتا چلا جار ہا تھا۔ اور اُس کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ پھر اچانک آنسو اُس کی آنکھوں سے سیلاب کی مانند رواں ہو گئے اور وہ چیخ پڑی۔

"بس کرو کاشان بیٹا!... بس کرو... اب میں اور برداشت نہیں کر سکتی" میرا پارہ اور چڑھ گیا۔ "ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری" میں دوبارہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ امی نے مجھے روک دیا۔ جو آوازیں سُن کر اپنے کمرے سے آ گئی تھیں

"بس کرو کاشان کیوں اس بے سہارا پریشان پر برس رہے ہو"

"امی... میں کہتا تھا ناں یہ چور ہے... آج اُس نے اپنی خصلت دکھا ہی دی... پتا ہے یہ میرا فٹ بال چُراتے ہوئے پکڑی گئی ہے"

"کیا... فٹ بال چُراتے ہوئے..." امی کی آنکھوں میں زمانے بھر کی حیرت در آئی۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بول پڑی۔

"ہاں بیگم صاحبہ میں ہی فٹ بال چرا رہی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میرا بھی ایک بیٹا تھا۔ کاشان بابو کی عمر کا جو گاڑی کے نیچے آکر مر گیا تھا۔ اس کی شکل بالکل کاشان بابو کی طرح تھی۔ مجھے ان میں اپنے بیٹے کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس لئے میں ان کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھ کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیتی تھی اور ان کی ہر چیز کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ ایک دفعہ اس فٹبال جیسا ہی ایک فٹبال میرے بیٹے کو بھی پسند آیا تھا۔ اور اُس کی ضد پر میں نے کافی دن روپے جمع کرنے کے بعد اُسے فٹبال لا کر دیا۔ مگر پہلے ہی دن وہ فٹ بال کے پیچھے بھاگتا ہوا باہر سڑک پر نکل گیا اور ایک کار کے نیچے آ گیا۔ کل جب کاشان بابو نے ضد کر کے یہ فٹ بال منگوالیا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے بیٹے کا قاتل اس گھر میں آ گیا ہو۔ گو کہ کاشان بابو کا رویہ میرے ساتھ کچھ اچھا نہ تھا۔ مگر میں پھر بھی ان کی شکل میں اپنا بیٹا دیکھتی تھی اور ایک کے بعد میں دوبارہ اپنا بیٹا کھونا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے میں یہ فٹبال..." اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کا گلا رُندھ گیا تھا۔

میرا سر ندامت سے جُھک گیا۔ جو عورت مجھے اپنا بیٹا سمجھتی تھی۔ میں نے فقط اُس کی غُربت اور ایک بے بنیاد شک کی بنا پر اس سے اتنا بُرا سلوک کیا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ امی کا اعتماد ایک ملازمہ پر نہیں بلکہ ایک ماں پر تھا۔ اور میں نے ایک ماں کی ممتا پر شک کیا تھا جو ایک ناقابلِ معافی جرُم تھا۔ میں بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ اور صرف اُس کے پاس جا کر رُک گیا۔ دو آنسو میری پلکوں میں اُلجھ کر رہ گئے۔ اُس نے آنسو پونچھتے ہوئے مجھے لپٹا لیا اور ممتا کے پیار نے مجھے احساس دلایا کہ آج پھر ایک ماں نے اپنے نافرمان بیٹے کے تمام جرُم صرف دو آنسوؤں کے عوض معاف کر دیئے تھے۔

شبنیر بیگ ناز

گاؤں کی ہوا

نرم کونپل، تازہ اور نتھری ہوئی
گاؤں کی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
صبح دم کھیتوں میں جب لہراتی ہے
اُس گھڑی جنّت کی یاد آجاتی ہے

شام کو آتی ہے ندیا پار سے
روپ حسن و دلکشی کا دھار کے
گاؤں پہ بادل اگر منڈلاتے ہیں
اس کے تیور اور کھلتے جاتے ہیں

پھول شاخوں سے لپٹ جائے کبھی
گود میں بوندیں لئے آئے کبھی
کچّی کچّی تنگ گلیوں میں چلے
اونچے چوباروں میں یہ پھولے پھلے

فرحت و راحت کے جوہر سے بھری
لگتی ہے اللہ کی بھیجی پری

شہر سے جس وقت گھبراتا ہوں میں
ناز گاؤں کو چلا جاتا ہوں میں

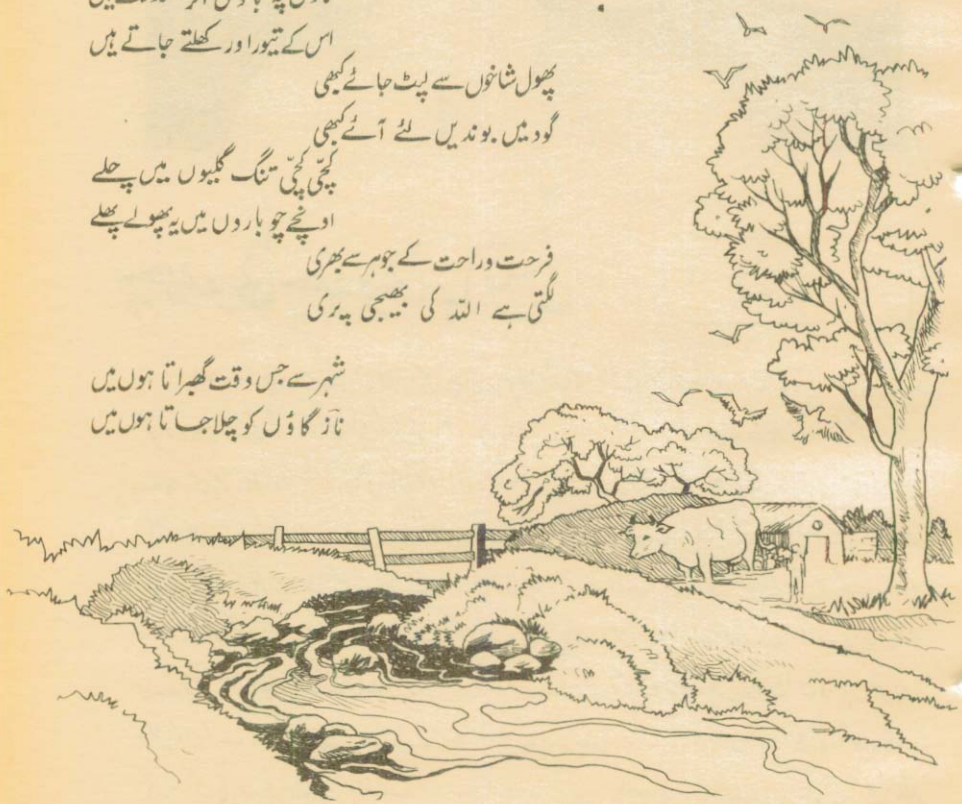

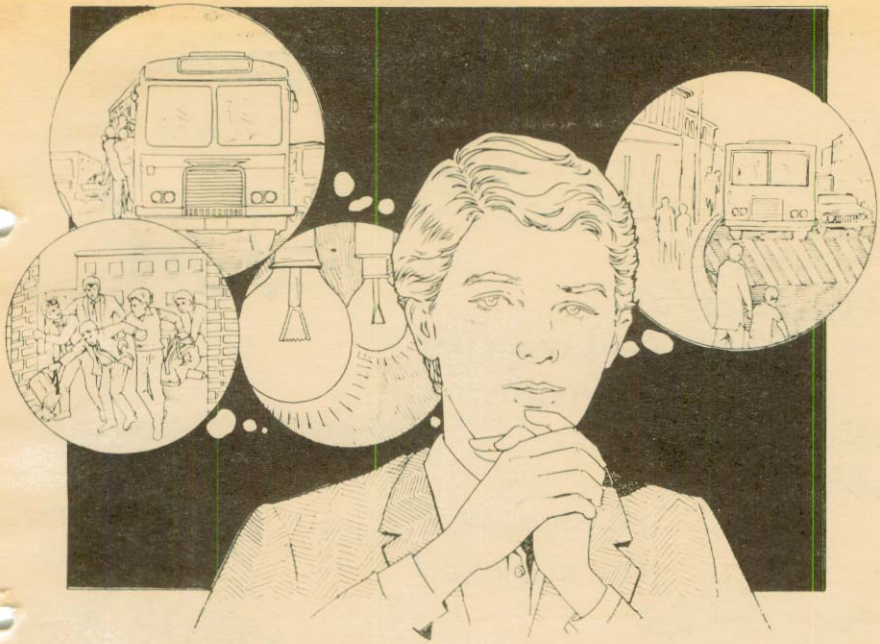

چھوٹی چھوٹی باتیں

محمد عادل منہاج

بس اسٹاپ پر بہت رش تھا۔ اجمل بیتابی سے کھڑا بس کا انتظار کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج پھر اسکول کو دیر ہو جائے گی مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی ایک بس آئی تھی مگر وہ بے حد بھری ہوئی تھی۔ اجمل نے پھر بھی چڑھنے کی کوشش کی تھی لیکن لوگوں کی دھکم پیل کی وجہ سے چڑھ نہ سکا۔ آخر کافی دیر بعد پھر بس آتی نظر آئی۔ اجمل تیار ہو گیا کہ اس بار بس میں ضرور گھس جاؤں گا۔ بس جیسے ہی آکر رکی۔ ایک جمِ غفیر اس پر ٹوٹ پڑا۔ ہر شخص بس میں گھسنے کی فکر میں تھا۔ کسی کو چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز نہ تھی۔ ہر ایک دوسرے کو جھنجھوڑتا ہوا اندر گھسنا چاہ رہا تھا۔ اجمل بھی کسی نہ کسی دروازے سے لٹک ہی گیا اور بس چل پڑی۔ اجمل سوچ رہا تھا کہ اگر بس اسٹاپ پر قطار بنالی جائے تو ہر شخص اطمینان سے اپنی باری پر بس میں چڑھ جائے اور کسی کو کوفت نہ ہو۔ مگر یہ تو صرف اُس کی سوچ تھی اس پر عمل کون کرے۔ کافی دیر بعد بس نے اُسے مطلوبہ اسٹاپ پر پہنچا دیا۔ سڑک کے دوسری طرف اجمل کا اسکول تھا۔ اجمل سڑک پار کرنے کے لئے سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ ٹریفک سیلاب کی طرح بہی چلی جا رہی تھی۔ اجمل انتظار

کر رہا تھا کہ ٹریفک کا زور ذرا کم ہو تو وہ سڑک پار کرے اگرچہ اس جگہ سڑک پر زیبرا کراسنگ بنی ہوئی تھی اور سڑک کے کنارے بورڈ بھی لگا تھا کہ آگے اسکول ہے آہستہ چلیے۔ مگر کسی کو بھی بورڈ پڑھنے، اس پر عمل کرنے اور زیبرا کراسنگ دیکھنے کی فرصت نہ تھی۔ کسی کو پیدل چلنے والوں کا خیال نہ تھا۔ آخر کار موقع ملتے ہی اجمل نے تیزی سے دوڑ کر سڑک پار کی اور اسکول میں داخل ہُوا۔ اُسے کافی دیر ہو چکی تھی۔ وہ تیزی سے اپنی کلاس کی طرف دوڑا۔ مگر ایک دم اس کا پاؤں پھسلا اور وہ دھڑام سے چاروں خانے چت گر پڑا۔ اپنا جسم سہلاتے ہوئے وہ اُٹھا تو اُس نے دیکھا کہ فرش پر کیلے کا چھلکا پڑا تھا۔ اور چند قدم کے فاصلے پر کوڑے کا ڈبہ رکھا تھا۔ جس پر لکھا تھا: "مجھے استعمال کیجئے: USE ME" مگر کسی کو کیا پڑی تھی کہ وہ اس جُملے پر غور کرے اور کوڑا کرکٹ ڈبے میں ڈالنے کی زحمت کرے۔ اجمل نے کیلے کا چھلکا ڈبے میں ڈالا اور اپنی کلاس کی طرف بڑھا۔ سر نے اُسے دیر سے آنے پر جھڑکا اور وہ سر جُھکائے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اور کام میں مشغول ہو گیا۔

پیریڈ ختم ہوا تو اُستاد صاحب چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی کلاس میں ایک شور و غل برپا ہو گیا۔ اجمل کچھ کام کرنا چاہتا تھا مگر اس ہنگامے میں بھلا کیا کام ہو سکتا تھا۔ اجمل نے سوچا کہ آخر ہم کلاس میں اطمینان، سکون اور خاموشی سے کیوں نہیں بیٹھ سکتے۔ یہ پیریڈ خالی تھا۔ اس لئے اجمل لائبریری میں پہنچا۔ ایک کتاب نکلوا کر پڑھنے لگا۔ مگر یہاں بھی بہت شور ہو رہا تھا۔ ایک میز پر چھوٹی سی تختی پر لکھا تھا: "باتیں کرنا منع ہے" تنگ آ کر اجمل لائبریری سے بھی نکلا اور بے مقصد اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرنے کے بعد وہ پانی پینے کُولر کے پاس پہنچا۔ یہاں ہر طالب علم پہلے پانی پینے کی جتن میں کولر پر گرا جا رہا تھا۔ بڑی مشکل سے گلاس اجمل کے ہاتھ لگا۔ مگر پانی پینا اس کے لئے مشکل ہو گیا۔ کیوں کہ لڑکوں کی چھینا جھپٹی کی وجہ سے آدھا پانی اس کے کپڑوں پر گر گیا۔ کپڑے جھاڑتا ہوا وہ یہاں سے نکلا۔ اُسی وقت اگلے پیریڈ کی گھنٹی بج گئی۔ اور وہ کلاس میں آ گیا۔ بارہ بجے چھٹی کی گھنٹی بجی۔ سب بچے دروازے کی طرف بھاگے جیسے اُنہیں قید سے رہائی مل گئی ہو۔ سب نے دروازے پر ہلّہ بول رکھا تھا۔ کوئی کسی کا پاؤں کُچل رہا تھا۔ کوئی کسی کے کپڑے کھینچ رہا تھا۔

اجمل اسکول سے کافی دیر بعد نکلا اور بس کی انتظار میں کھڑا ہو گیا۔ اتفاق سے اُس کے دوست کے والد کار میں اُدھر سے گزرے انہوں نے اجمل کو دیکھا تو اُسے بھی کار میں بٹھا لیا کہ اُسے اُس کے گھر اُتار دیں گے۔ اجمل نے بھی سکون کا سانس لیا۔ کہ چلو اس وقت تو بس میں دھکے کھانے سے بچے۔ سڑک پر بے حد ہجوم تھا۔ کاریں، ویگنیں، بسیں، موٹر سائیکلیں اور سائیکلیں سب بے ترتیب انداز میں اِدھر اُدھر سے آگے نکلنے کی فکر میں تھیں۔ اجمل نے سوچا کہ اگر سب ٹریفک کے قوانین کی پابندی کرتے ہوئے ترتیب سے چلیں تو اتنا ہجوم تو

نہ ہو۔ پیدل چلنے والے بچ بچ کر سڑک کے کونے پر چل رہے تھے۔ کیونکہ فٹ پاتھوں پر یا تو کاریں اور دوسری گاڑیاں پارک کی گئی تھیں یا ٹھیلے لگائے گئے تھے۔ اور دکانیں سجائی گئی تھیں لہٰذا اب پیدل چلنے والے کریں تو کیا کریں۔ آگے کنواں پیچھے کھائی۔ اجمل کے دوست کے والد بار بار ہارن بجا رہے تھے۔ اجمل نے کھڑکی سے باہر دیکھا سڑک کے کنارے ہسپتال تھا۔ اور سامنے بورڈ لگا تھا جس پر "ہارن بجانا منع ہے" کا نشان بنا تھا۔ مگر ہر طرف زوردار ہارن گونج رہے تھے۔

اجمل گھر پہنچ کر کھانا وغیرہ کھا کر سو گیا۔ سہ پہر کے وقت اُس کی امّی نے اُسے بجلی کا بل جمع کرانے بھیجا۔ بینک پر کافی لمبی قطار لگی تھی۔ اجمل بھی قطار میں لگ گیا۔ کافی دیر ہو گئی قطار وہیں کی وہیں تھی اور آگے بڑھتی بھی کیسے۔ بہت سے لوگ قطار کے بیچ میں گھستے جا رہے تھے۔ دوسرے اعتراض کرتے تو وہ لڑنے جھگڑنے پر اُتر آتے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد اجمل کا نمبر آیا تو بل جمع کرنے والا شخص اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دوسری میز پر جا کر چائے پینے میں مصروف ہو گیا۔ اجمل کو یہ دیکھ کر بہت غصہ آیا کہ باہر سینکڑوں افراد جن میں بیمار اور بوڑھے بھی ہیں۔ بل جمع کروانے کھڑے ہیں۔ اور کاؤنٹر کا آدمی سب سے بے نیاز بڑے مزے سے چائے پی رہا تھا۔

بل جمع کروا کر تھکا ہارا وہ گھر کی طرف روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر تھک کر لیٹ گیا۔ شام کو اُٹھا اور نماز وغیرہ پڑھ کر اسکول کا کام کرنے لگا۔ رات کو اُس نے دیکھا کہ گھر کے بہت سے بلب فالتو بھی جل رہے تھے۔ اُس نے فضول میں جلنے والے بلب بجھائے۔ باورچی خانے میں چولہا بھی یونہی جل رہا تھا بند کیا۔ کتنی بُری بات تھی کہ اپنی ذرا سی لاپرواہی کی وجہ سے ہم اپنا بھی نقصان کرتے ہیں اور قومی سرمایہ بھی ضائع کرتے ہیں۔ اُس نے سوچا کہ اگر ہم چاہیں تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر عمل کر کے نہ صرف بہت سی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں بلکہ اپنی زندگی کو بھی خوشگوار بنا سکتے ہیں۔

جانور آپ کی محبت کے مستحق ہیں

جانور بے زبان ہوتا ہے اس لیے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ مگر جانور آپ کے پیار کو محسوس کر کے آپ کا مطیع ضرور بن سکتا ہے

جانور اگر درندہ نہیں تو اُس سے محبت کیجیے اس کا خیال رکھیے

ادارہ آنکھ مچولی

بدگمان

بن یامین

کاشف نے رسالہ اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اور خود بوجھل قدموں سے چلتا ہُوا آکر بستر پر گر گیا۔

"کیا ہُوا بیٹا؟" امّی نے جو اُسے اتنا مایوس لیٹے دیکھا تو پوچھا۔

"کچھ نہیں امّی۔" کاشف اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں سمجھ گئی" امّی مُسکراتی ہوئی بولیں۔ "شاید اس دفعہ بھی تمہاری کہانی نہیں چھپ سکی۔"

"آپ خود ہی سوچیں امّی! یہ لوگ شاید اپنے جاننے والوں ہی کی کہانیاں چھاپتے ہیں۔" کاشف تلخ لہجے میں بولا۔

"نہیں بیٹا! آپ اس دفعہ ذرا اور محنت کر کے لکھیں۔ شاید چھپ ہی جائے۔"

"محنت! محنت! آپ کو پتا ہے یہ گیارہویں کہانی تھی جو میں نے لکھی ہے۔"

"پھر بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔" امّی مشورہ دے کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔ کاشف میاں تھوڑی

دیر تو بے سُدھ لیٹے رہے پھر قلم کاغذ اُٹھا کر خط لکھنے لگے۔

جناب ایڈیٹر صاحب ماہنامہ "چھپا چھپائی"

السلام علیکم!

یہ شاید میرا آخری خط ہو۔ بات مختصر کروں گا کیوں کہ میں آپ کا قیمتی وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ اپنا یہ رسالہ اب بند ہی کر دیں تو اچھا ہے۔ کیونکہ کہنے کو تو یہ بچّوں کا رسالہ ہے مگر اس میں بچوں کی لکھی ہوئی کوئی تحریر شائع نہیں ہوتی۔ الّا ماشاءاللہ۔ آپ بڑے مصنفوں کی تحریریں ضرور چھاپیں مگر اس کے ساتھ ہم کو بھی تو جگہ دیا کریں۔ آپ کا رسالہ زیادہ تر آپ کے ادارے کے لوگوں کی تحریروں سے بھرا ہوتا ہے۔ ایک کہانی شکیل صدیقی کے نام سے شائع ہوتی ہے تو تھوڑی ہی دُور چل کر ایک معلوماتی مضمون "ش، صدیقی" کے نام سے چھپی نظر آتی ہے۔ مگر آپ کو روکنے والا کون ہے۔ آخر آپ کب تک بچّوں کو بے وقوف بناتے رہیں گے۔

فقط :- کاشف احمد (آپ کا سابق قاری)

یہ خط لکھ کر کاشف میاں نے اُسے لفافے میں بند کر دیا اور اُسے پوسٹ کرنے ڈاکخانے تک گئے ... ڈاکخانہ چونکہ خاصا دُور تھا۔ اس لئے واپسی پر وہ بُری طرح تھک چکے تھے۔ بستر پر پڑتے ہی گہری نیند نے انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

کاشف میاں حیران پریشان چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ یہاں کیسے پہنچ گئے۔ وہ تو اپنے بستر پر سوئے تھے۔ اور اس وقت وہ شہر کی بھری پُری شاہراہ پر کھڑے تھے۔ کچھ دیر تو حیران پریشان ہوتے رہے پھر ان کی نظر اچانک ایک سائن بورڈ پر پڑی جس کو دیکھ کر انہیں خوشگوار حیرت ہوئی وہ سائن بورڈ تھا "دفتر ماہنامہ چھپا چھپائی" جس پر بنا ہُوا تیر سامنے والی عمارت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ دفتر شاید تیسری منزل پر تھا۔ کاشف نے سوچا کیوں نا ایڈیٹر صاحب سے بالمشافہ گفتگو کر لی جائے۔ اس غرض سے وہ سامنے والی عمارت میں داخل ہو گئے۔ تیسری منزل پر پہنچ کر جیسے ہی وہ دفتر میں داخل ہونے لگے ... دروازے میں موجود چپراسی نے سلام جھاڑ دیا۔

"اسلام علیکم صاحب جی"

"صاحب جی؟" کاشف نے سوچا "کیا یہاں ہر ایک کی اسی طرح پذیرائی کی جاتی ہے۔ بہرحال وہ سلام کا جواب دے کر اندر داخل ہوئے۔ اندر کچھ افراد میز کرسیوں پر موجود مختلف کام کر رہے تھے۔

کاشف میاں کو دیکھ کر سب اپنی جگہ کھڑے ہو گئے۔

"کیا آپ سب کا اسی طرح استقبال کرتے ہیں؟" اُس نے حیرانی سے پوچھا۔
"سب کا تو نہیں،" کوئی بولا۔ "آپ بہرحال ایڈیٹر ہیں۔"
"میں اور ایڈیٹر؟" کاشف نے زور دار قہقہہ لگایا۔ "آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"
"سر خیریت تو ہے۔ کیا آپ بھُول گئے۔ آپ نے پچھلے ہی ہفتے تو یہاں کا چارج سنبھالا ہے۔"
کاشف کو اپنا سر گھُومتا ہوا محسوس ہُوا۔ پھر وہ اُسے ایک سنگین مذاق سمجھ کر طنزیہ انداز میں بولا۔ "اچھے مجھے ذرا میرا کمرہ تو دکھائیے۔"
"سر آپ کیوں مذاق پر تلے ہوئے ہیں۔ وہ سامنے آپ کا کمرہ ہے۔"
کاشف نے سر اُٹھا کر دیکھا تو اُسے "EDITOR" کی تختی لگی ہوئی نظر آئی۔ کاشف بے یقینی کے عالم میں کمرے کی طرف بڑھا۔ اُس نے سوچا ایڈیٹر سے تو بہرحال ملاقات کرتا ہی جائے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہُوا۔ تو کمرہ خالی تھا۔
قریب ہی تھا کہ وہ واپس پلٹتا۔ میز پر رکھی ہوئی تختی نے اُس کے قدم روک دیئے۔ اس تختی پر اس کا اپنا نام لکھا ہُوا تھا۔ یہ شاید اس صدی کا حیرت انگیز ترین واقعہ تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ اللہ کا نام لے کر کرُسی سنبھال کر اس پر براجمان ہو گیا۔
کاشف کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کرُسی پر بیٹھ کر کیا کرے اور کیا نہیں کرے۔ ابھی اسی اُدھیڑ بُن میں پڑا ہُوا تھا کہ دروازے کی طرف سے آواز آئی۔
"مے آئی کم ان سر" اس کا ایک ماتحت اندر آنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔
"آیئے آیئے" وہ اندر داخل ہُوا اور کاغذات کا ایک پلندہ کاشف کی میز پر رکھ کر جانے لگا۔
"ٹھہریئے یہ کیا ہے؟" کاشف نے آواز دی۔
"سر یہ بچّوں کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ آپ ان میں سے کچھ منتخب کر کے ان کی اصلاح کر دیجئے۔"
"لاحول ولا قوۃ،" کاشف نے سوچا "اتنی ڈھیر ساری کہانیوں میں سے منتخب کروں اور پھر ان کی اصلاح بھی کروں۔ مروادیا۔"
"اچھا آپ جائیں میں دیکھ لوں گا۔"
اس کے جانے کے بعد وہ بچّوں کی لکھی ہوئی کہانیاں دیکھنے لگا۔ ان میں سے تو بعض اتنی گندی تحریر میں لکھی ہوئی تھیں کہ کاشف ان کو بغیر دیکھے ایک طرف ڈالنے لگا۔ ایک تحریر اُسے کچھ جانی پہچانی سی محسوس

ہوئی۔ نام دیکھا تو اس کا اپنا نام تحریر تھا۔ یہ کہانی شاید اُس نے پہلے کبھی لکھ کے بھیجی ہو۔ پہلے تو سوچا کہ گندی تحریروں کے ساتھ اصولاً اسے بھی جانا چاہیے۔ مگر پھر خیال آیا کہ یہ تو اس کی لکھی ہوئی تحریر ہے۔ وہ خود تو اُسے باآسانی پڑھ سکتا ہے۔ لہٰذا اُسے صاف تحریروں کے ساتھ شامل کر دیا۔ دل ہی دل میں وہ شرمندہ تھا کہ پُرانے ایڈیٹر صاحب بھی اس کی کہانیوں کے ساتھ یہی کرتے ہوں گے۔ ان کو الزام کیا دینا۔

بالآخر اُس نے کہانیاں پڑھنی شروع کر دیں۔ بعض تو واضع طور پر چوری کی تھیں۔ اُس نے ان کہانیوں کو الگ کرنا شروع کر دیا۔ اس نے سوچا اگر پھر بھی کوئی ایسے رسالے سے کہانی چوری کر کے بھیج دے جس تک اُس کی پہنچ نہ ہو سکی ہو تو وہ کیسے پہچانے گا؟ ظاہر ہے اس کو شائع کرنے میں اس کا قصور تو نہ ہوگا۔ لیکن وہ خود ایسی کہانیوں کی اشاعت کا ذمے دار ایڈیٹر کو ٹھہراتا تھا۔ اُسے یہ سوچ کر کافی شرمندگی ہوئی۔ ایڈیٹر کے پاس بہرحال اتنا وقت تو نہیں ہوتا کہ وہ تمام معروف و غیر معروف رسائل پڑھے۔

ان تحریروں میں کچھ کہانیاں تھیں اور کچھ نظمیں۔ نظمیں تو ایسی تھیں کہ اگر ان کو نظم قرار دے دیا جاتا تو شاید بڑے شاعر نظمیں کہنا ہی چھوڑ دیتے۔ کہانیوں میں سے بھی اکثر ایسی تھیں کہ جن کا نہ کوئی سر تھا نہ کوئی پیر۔ کوئی پلاٹ نہیں تھا۔ کوئی خاص موضوع نہیں۔ ان کی کیا اصلاح ہو۔ بڑی مُشکل سے وہ تین چار کہانیاں منتخب کر پایا۔ ان تحریروں سے وہ اپنی لکھی ہوئی تحریر کا موازنہ کرنے لگا۔ اُسے کافی خفّت ہوئی کہ اس کی تحریر کسی طرح اس قابل نہیں تھی کہ وہ ان کا مقابلہ کر سکے۔ ایک تو اُس نے پریوں اور جنّوں کی کہانی لکھ کے بھیجی تھی جبکہ موجودہ دور سائنس اور کمپیوٹر کا دور تھا۔ بچّے سائنس فکشن اور جاسوسی و مزاحیہ کہانیاں پڑھنا پسند کرتے تھے۔ ایک لمحے کے لئے اُس نے سوچا کہ وہ اپنی تحریر شائع کر ہی دے۔ لیکن رسالے کی ساکھ کا کیا ہوگا۔ جو تین چار کہانیاں اُس نے منتخب کی تھیں اُن میں کافی حد تک نا پختگی تھی۔ ان کی ترمیم اور اصلاح کیسے ہو؟ وہ تو ان معاملات میں بالکل اناڑی تھا۔ اچانک اُس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اُس نے میز پر رکھی گھنٹی بجائی ...

"جی سر" چپراسی نے آکر پوچھا۔

"شکیل صدیقی صاحب کو بھیج دو" یہ کہہ کر اُس نے اپنا سر کُرسی کی پشت پر ٹکا دیا۔ تھوڑی دیر بعد شکیل صدیقی صاحب اس کے سامنے بیٹھے تھے۔ وہ رسالے کی مجلسِ ادارت میں تھے۔

"دیکھئے شکیل صاحب اس وقت میں مصروف ہوں۔ یہ کچھ تحریریں ہیں۔ ان میں ترمیم کر کے ان کو اشاعت کے قابل بنا دیں۔"

"اور ہاں! ابھی تک کسی بڑے مصنف کی تحریر ہم تک نہیں پہنچی"۔

کاشف نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔

"سر اس کے لئے آپ کو خود ان سے اصرار کرنا پڑے گا۔ ویسے بائی داوے آپ اس فیلڈ میں بالکل نئے معلوم ہوتے ہیں"۔

"جی ہاں" کاشف نے شرمندہ ہو کر کہا" اچھا آپ مجھے ان ادیبوں کے ٹیلیفون نمبر پہنچا دیں"۔

تھوڑی دیر میں چپراسی ان ادیبوں کے ٹیلی فون نمبر لے کر آ گیا۔ سب سے اوپر مرزا رفیق احمد کا نام لکھا تھا۔ ان کی کہانیاں وہ خود مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔

وہ شاید مصروف تھے۔ بڑی مشکل سے ان سے رابطہ قائم ہو سکا۔

"السلام علیکم جناب" کاشف نے کہا" کہیے کیسے مزاج ہیں؟"

"معاف کیجیے گا میں نے آپ کو پہچانا نہیں" دوسری طرف سے آواز آئی۔

"اوہ! دیکھئے میں میں ماہنامہ چھپا چھپائی کا نیا ایڈیٹر بول رہا ہوں۔ دراصل اس لئے آپ کو زحمت دی ہے کہ آپ اپنی کسی تحریر سے ہمارے رسالے کو نوازیں تو مہربانی ہوگی" کاشف نے کہا۔

"دیکھئے میں بہت مصروف ہوں"

"پھر بھی اگر آپ تھوڑا سا وقت نکالتے تو احسان ہوتا آپ کا"

"معاف کیجیے گا۔ مجھے دوسرے رسائل کے لئے بھی لکھ کے دینا ہے۔ جن کا میں وعدہ کر چکا ہوں۔ آپ کسی اور سے رابطہ قائم کریں"۔

کاشف نے ایک ایک کر کے سب سے رابطہ قائم کیا مگر ہر طرف سے انکار ملا۔ اُسے احساس ہو کہ ان ادیبوں کی تحریریں حاصل کرنے کے لئے ذاتی تعلقات کتنے ضروری ہوتے ہیں۔ وہ ان تحریروں کی اشاعت کا مخالف تھا مگر اُسے آج اندازہ ہوا کہ یہ تحریریں حاصل کرنا کتنا مشکل کام ہے۔

رسالہ آنے میں صرف دس دن رہ گئے تھے۔ مگر رسالے کا پیٹ کیسے بھرا جائے۔ کس کی تحریریں شائع کی جائیں۔

اُس نے پھر مجلسِ ادارت کے ارکان کو بلوا بھیجا۔

"آپ لوگ اپنی تحریریں دے چکے ہیں کتابت کے لئے؟"

"جی ہاں! میں نے ایک کہانی لکھ کے دے دی ہے" شکیل صدیقی نے کہا۔

"اور میں نے ایک معلوماتی فیچر لکھا ہے" احمد فاروق بولے۔

"براہِ کرم آپ لوگ اپنے اور مضامین بھی لکھ کے دیں۔"

"مگر سر! ہماری ایک سے زیادہ تحریریں شائع ہوں تو بچے اعتراض کرتے ہیں۔"

"اور کیا کیا جا سکتا ہے۔ ادیبوں نے اگلی دفعہ کچھ لکھ کر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اور رسالہ آنے میں صرف دس دن رہ گئے ہیں۔"

جیسے تیسے کرکے رسالے کا پیٹ بھرنے کا مواد اکٹھا کیا گیا۔ سرِ ورق کا تو کاشف کو خیال ہی نہیں رہا تھا۔ جلدی میں انتہائی واجبی سا سرِ ورق میسر ہو سکا۔

رسالہ چھپ کر آچکا تھا۔ مگر اس دفعہ اس کی فروخت بہت کم تھی۔ بہت سے بچوں نے تو محض سرِ ورق دیکھ کر رسالہ نہ لیا۔ جنہوں نے لیا انہوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ تنقیدی خطوط اور ٹیلیفون کا تانتا سا بندھ گیا۔

کاشف اپنے کمرے میں پریشان ٹہل رہا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ یہ رسالے کے فنانسر FINANCER کا ٹیلیفون تھا۔

"مسٹر کاشف! آپ کی یہ کارکردگی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس دفعہ سرکولیشن کیا رہی ہے۔ اگر اسی طرح رسالہ چلتا رہا تو ہمارا دیوالیہ نکل جائے گا۔ معیار یہی رہا تو ہمیں اشتہارات ملنا بھی بند ہو جائیں گے۔"

"مگر اس میں میرا کیا قصور ہے" کاشف نے جھلا کر چیخنا شروع کر دیا۔

"کیا ہوا بیٹا!" کاشف نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو اس کی امی اس پر جھکی ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں امی" کاشف نے جھینپ کر کہا "شاید میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔"

نیا پرچہ آیا تو کاشف اُسے خرید کر لایا۔ پہلے ہی صفحے پر اُس کے خط کا جواب موجود تھا۔

"میاں کاشف! آپ نے رسالہ نہ پڑھنے کا تہیہ کر رکھا ہے مگر ہمیں یقین ہے یہ جواب آپ ضرور پڑھ رہے ہوں گے۔ دیکھیے اچھی تحریریں تو ہماری ضرورت ہوتی ہیں۔ آپ ذرا مطالعہ کرکے اور حقیقت سے قریب کہانیاں لکھیں اور کسی بڑے کو دکھا دیں تو یہ بہتر ہوگا۔ آپ کی کہانیوں کی جو کمزوریاں ہوتی ہیں وہ ہم خود دُور کر دیتے ہیں۔ کہانیاں آپ صاف لکھ کر بھیجیں تاکہ اُنہیں کم از کم پڑھ تو سکیں۔"

کاشف نے اس دفعہ پھر بڑی محنت سے کہانی لکھ کے بھیجی۔ یہ دیکھ کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کی کہانی اس دفعہ شائع ہو گئی ہے۔ ویسے یہ الگ بات ہے کہ وہ کہانی پچیس فیصد کاشف نے لکھی تھی اور پچھتر فیصد.... جی ہاں! ایڈیٹر صاحب نے۔

اللہ تعالیٰ نے حیوانات کی مخصوص ضرورتوں اور اُن کی مجبوریوں اور مسائل کا خیال کرتے ہوئے اُن کے پاؤں اس طرح بنا دیئے ہیں کہ وہ ہمارے مقابلے میں زیادہ سختیاں آسانی سے جھیل سکتے ہیں۔ یہاں پر ہم آٹھ مختلف جانوروں کے پاؤں آپ کو دکھا رہے ہیں آپ غور سے دیکھئے اور بتائیے کہ کون سا پاؤں کس جانور کا ہے ...؟

بُوجھو تو جانیں گے — ہم تم کو مانیں گے

کان کئی طرح کے ہوتے ہیں سونے کی کان، کوئلے کی کان نمک کی کان، لیکن کچھ کان ان سب سے مختلف ہوتے ہیں، یہ کان ہوتے ہیں سُننے کے کان۔ ان تصاویر میں مختلف جانوروں کے کان دیکھئے اور آہستہ سے ہمارے کان میں بتائیے کہ کون سا کان کس کا ہے ...؟

① میں اس گھڑی ہوں گرچہ خلائی لباس میں
میں اس کے باوجود ہوں اپنے حواس میں

② نہ اُڑ رہا ہوں نہ پھسل رہا ہوں
خلا میں کپڑے بدل رہا ہوں

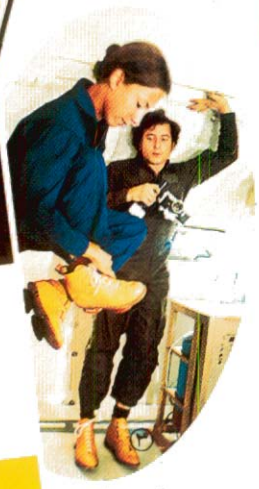

③ خلا میں آلات ٹیسٹ کرنے کا ایک منظر

④ خلائی غبارے میں بیٹھنے کے
تین مختلف مناظر

اگر ہم بے وزن ہو جائیں تو کیسا لگے ہم کو

سلمیٰ سلیم

بحیثیت ایک قوم کے ہمیں بہت سی باتیں فرض کر لینے کی عادت ہے۔

سب سے زیادہ جو بات ہم فرض کرتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ہم اچھے اور باقی لوگ بُرے ہیں۔ بھئی بُرا مت مانیئے۔ ہم خود اس وقت یہی بات فرض کر رہے ہیں۔ ہاں تو آپ کی فرض کرنے کی اس عادت کے پیشِ نظر ہم آپ سے چند باتیں فرض کرنے کی درخواست کرتے ہیں۔ فرض کیجئے کہ آپ چڑیا کے پَر کی طرح ہلکے پھلکے ہیں۔ فرض کیجئے آپ اپنے ایک بال کے برابر وزن رکھتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ بالکل بے وزن ہیں۔ معلوم ہے اگر آپ بالکل بے وزن ہو جائیں تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟ پھر یہ ہو سکتا ہے کہ آپ عام حالت کے برعکس بیک وقت اپنے دونوں پاؤں زمین سے اُٹھا سکتے ہیں اور جناب ایسا کرتے ہوئے آپ منہ کے بل نہیں گریں گے اور ہاں ایسی حالت میں اگر کوئی آپ کو ہلکا سا دھکا دے دے تو آپ کمرے یا خلائی جہاز میں ایک کونے سے دوسرے کونے تک تیرتے ہوئے چلے جائیں گے بالکل ایسے جیسے آپ پانی میں تیر رہے ہوں۔

آپ کے خیال میں بے وزن ہونا مزیدار بات ہے؟ جی ہاں واقعی یہ بہت مزیدار بات ہے۔ برابر کے صفحے پر موجود لوگوں کا خیال بھی یہی ہے، اور بھئی ان لوگوں کی بات اس لئے مستند ہے کہ ان لوگوں کا کام ہی خلا کے اندر مختلف آلات کو ٹیسٹ کر کے یہ دیکھنا ہے کہ وہ خلا میں کس طرح کام کرتے ہیں۔

خلا میں کششِ ثقل اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہاں کسی بھی شے کا کوئی وزن نہیں رہتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلاباز خلائی جہاز میں اپنے آپ کو کسی شے کے ساتھ باندھ کر رکھتے ہیں تاکہ وہ تیرتے ہوئے اِدھر اُدھر نہ ہو جائیں۔ اسی طرح خلا میں پینے کا پانی اور کھانے پینے کی اشیا کو بھی اچھی طرح سیل کر کے رکھا جاتا ہے ورنہ وہ بہل کر خلا میں شور پیدا کرنے کا سبب بن سکتی ہیں۔

خلا میں نئے آلات کو ٹیسٹ کرنے کا کام اگر خلائی جہاز کے ذریعے انجام دیا جائے تو اُس پر خاصی لاگت آتی ہے۔ چنانچہ امریکہ کا نیشنل ایرونوٹکس اینڈ اسپیس ایڈمنسٹریشن (NASA) کا ادارہ آلات کی جانچ کے لئے ایک خصوصی طیارہ استعمال کرتا ہے۔ جو ۳۳ ہزار فٹ کی بلندی تک پرواز کر سکتا ہے۔ اس بلندی پر کششِ ثقل مکمل طور پر ختم ہو جاتی ہے۔ تاہم یہ جہاز اس بلندی پر صرف ۳۰ سیکنڈ تک پرواز کرتا ہے اس کے بعد یہ پھر ۲۴ ہزار فٹ کی

بلندی پر پرواز کرنے لگتا ہے۔ ایسی ایک دن کی پرواز میں یہ جہاز کوئی سوبار ۳۳، ہزار فٹ کی بلندی پر جاتا ہے۔ اس بلندی پر جہاز کے اندر موجود ماہرین آلات کی جانچ کرتے ہیں۔

خلا میں جانے کے لئے خصوصی سوٹ استعمال کئے جاتے ہیں۔ اگر یہ سوٹ استعمال نہ کئے جائیں تو خلا میں داخل ہوتے وقت اور زمین پر اُترتے وقت دباؤ کی ایک دم تبدیلی سے خلا نوردوں کو شدید جسمانی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہلاک بھی ہو سکتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر خلائی جہاز خلاء میں خراب ہو جائے تو اس میں موجود لوگوں کا کیا بنے گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ خلا نوردوں کو خراب خلائی جہاز سے دوسرے محفوظ جہاز تک پہنچانے کے لئے خاص طور پر تیار کئے گئے بڑے بڑے غبارے استعمال کئے جاتے ہیں خلا نورد ان غباروں میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر یہ غبارے ایک جہاز سے دوسرے جہاز تک اُڑتے ہوئے پہنچ جاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان دلچسپ باتوں کو پڑھ کر آپ کے دل میں بھی خلا میں سفر کرنے کا خیال پیدا ہو گیا ہوگا۔ بھئی آپ کو خلا میں سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے آپ تو خود ہی اتنے ہلکے پھلکے ہیں کہ اپنے کمرے کے پنکھے کو ذرا تیز چلا کر اپنے کمرے ہی میں اُڑنے کے مزے لُوٹ سکتے ہیں۔ دیکھئے دیکھئے ناراض مت ہوئیے ہم تو صرف اتنا کہنا چاہ رہے ہیں کہ ذرا اپنی صحت کا خیال رکھا کریں۔ بچے تو موٹے تازے یعنی صحت مند اور گداز گداز ہی اچھے لگتے ہیں اور جناب ایسا لگن خلاء میں اُڑنے سے زیادہ اہم ہے۔ آخر جان ہے تو جہان ہے!

کوڑے دان کی دردمندانہ اپیل

سب کو اپنا حق عزیز ہوتا ہے۔
کوڑا کرکٹ میرا حق ہے
میرے حق کو گلی میں مت پھینکیے۔
مجھے میرا حق دیجیے۔
ورنہ!
مکھیوں، مچھروں اور صفائی پسند
پڑوسیوں سے روزانہ جنگ کے لیے تیار ہو جائیے۔

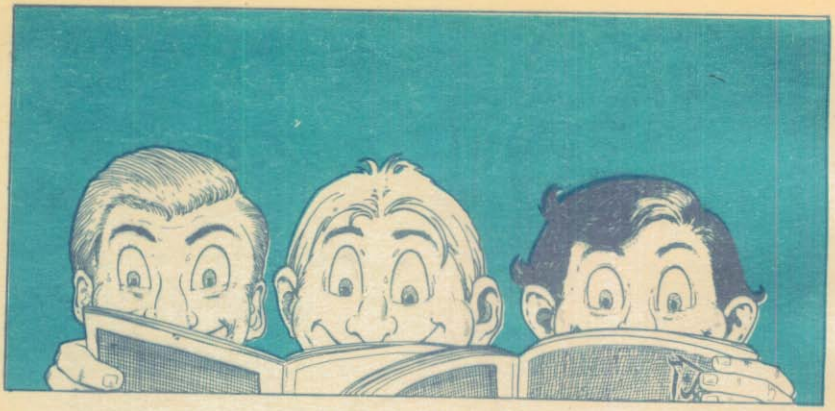

بے نقط لطیفہ

دو ڈاکو کسی آدمی کے گھر گھس گئے اور گھر کے مالک سے کہا۔

"اُٹھو! گولی ماردوں گا اگر کسی کو اطلاع کی"

گھر کا مالک: "اللہ کے واسطے رحم کر"

ڈاکو: "ہم ڈاکوؤں کا دل رحم سے عاری ہے"

گھر کا مالک: "مگر۔ک۔۔ک۔۔۔کس ارادے سے آئے ہو"

ڈاکو: "ارے گولی مارو ارادے کو۔ ٹائم کم ہے۔ اس گھر کا سارا مال ہمارے حوالے کردو"

گھر کا مالک: "ارے واہ کمال ہے سارا مال کس طرح دے دوں۔ گھر کا آدھا مال ہمارے ہمسائے کا ہے"

بہترین اور انعامی ۔ بے نقط لطیفہ (عمر نواز ماہر، بنوں)

دوسری جنگِ عظیم کے دوران برطانوی وزیرِاعظم مسٹر چرچل تقریر کر رہے تھے۔ پارلیمنٹ کے ارکان خاموش بیٹھے تھے: "ہم برطانیہ کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں، ہم فرانس کی آزادی کے لئے لڑ رہے ہیں۔ ہم پولینڈ کی آزادی کے لئے..."

ایک رُکن نے فقرہ کسا "ہم جہنم کی آزادی کے لئے بھی"

مسٹر چرچل نے بات کاٹتے ہوئے کہا: "ہر شخص کو اپنے وطن کی آزادی کے لئے لڑنے کا حق ہے"

عمر خطّاب خان ۔ اورنگی ٹاؤن کراچی

کھٹے میٹھے

ماہِ رواں کے منتخب لطائف

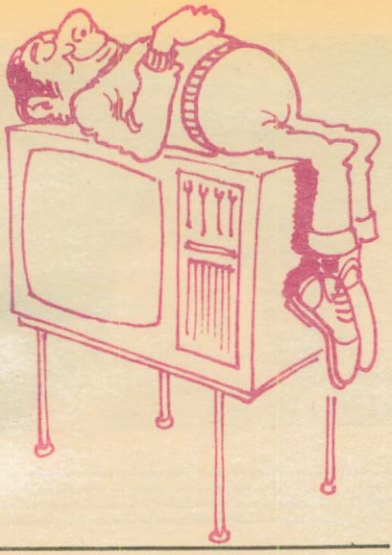

ایک اداکار اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا کہہ رہا تھا۔

"کل رات اسٹیج پر میری اداکاری دیکھ کر لوگوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔"

"ناممکن! اتنے سارے لوگ ایک ہی وقت میں جماہی نہیں لے سکتے۔" ایک دوست نے کہا۔

محمد عمران قادر - ٹنڈو آدم

شوہر اپنے ماہانہ بلوں کی ادائیگی کے بارے میں بہت پریشان تھا۔ اُس نے بیوی سے کہا۔

"اس ماہ اخراجات بہت زیادہ ہوگئے ہیں حیران ہوں کہ ڈاکٹر کا بل ادا کروں یا بجلی کا؟"

بجلی کا بل ادا کردو۔" بیوی نے کہا۔" ڈاکٹر ہمارا دورانِ خون تو بند کرنے سے رہا۔"

محمد اعجاز خان بابر زئی - جامشورو

میاں بیوی کے دوران جھگڑا بہت بڑھ گیا تو شوہر گھر سے باہر آکر دہلیز پر بیٹھ گیا۔ اتفاقاً اُسی وقت اُس کا دوست اُس سے ملنے آگیا اور حیران ہوکر بولا۔

"یار اتنی سرد ہوا چل رہی ہے اور تم باہر بیٹھے ہو..." شوہر نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولا۔

"میں اندر نہیں بیٹھ سکتا۔"

"کیوں بھئی؟" دوست بولا۔

"اس لئے کہ آتش دان کا دُھواں پریشان کرتا ہے۔" دوست بولا۔" تو کیا ہُوا، ہم دھوئیں کا رُخ دوسری طرف موڑ دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُس نے دروازہ کھولا۔ تو اندر سے جُوتے، گلدان مع کوسنوں اور لعن طعن کے برسنے شروع ہوگئے۔ دوست نے بوکھلا کر دروازہ بند کردیا۔ اور بولا۔

"گھبراؤ مت یار میرے گھر کا آتشدان بھی کبھی کبھی اسی طرح دُھواں دینے لگتا ہے۔"

محمد عمران احمد - فیڈرل بی ایریا کراچی

شوہر "تم مجھ پر ہمیشہ غائب دماغی کا الزام لگاتی ہو۔ مگر دیکھو آج میں حامد کے گھر سے واپسی پر یاد سے اپنی اور تمہاری چھتری اُٹھا کر لایا ہوں۔"

بیوی "لیکن ہم دونوں میں سے کوئی بھی چھتری لے کر وہاں نہیں گیا تھا۔"

نور بن رفیع - لاہور کینٹ

ایک مداری ایک بہت بڑے مجمع میں کرتب دکھا رہا تھا۔ اُس مداری نے اپنے کوٹ کی جیب میں

سے ایک لیموں نکالا۔ اور اُس کے رس کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیا اور پھر مجمعے سے کہا۔

"ہے کوئی مائی کا لال جو اس لیموں سے ایک قطرہ بھی نکال سکے" یہ سُن کر مجمعے میں خاموشی چھا گئی۔ چند لمحوں بعد مجمعے میں سے ایک نوجوان آدمی نکلا۔ اور اُس سے لیموں لے کر اُس میں سے بہت سے قطرے نکال کر دکھا دیئے۔

مداری حیران رہ گیا۔ اُس نوجوان سے پوچھا "تم کون ہو؟" نوجوان نے جواب دیا۔

"میں انکم ٹیکس آفیسر ہوں"

عبدالقیوم فتح محمد قریشی، حیدر آباد

"آپ بڑے ہو کر کیا بنیں گے؟"

"میں مریض بن کر ڈاکٹروں کی خدمت کروں گا"

نامعلوم ، بھلوال

ایک بچے کا ذہنی رجحان معلوم کرنے کے لئے اُس کے بڑے بھائی نے یہ کام کیا کہ ایک کمرے میں قلم، دس کا نوٹ، ایک چاقو اور ایک فلمی اداکار کی تصویر رکھ دی۔ بچے کو کمرے میں بھیج کر خود چھُپ کر اُسے دیکھنے لگا۔ بچے نے کمرے میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر قلم اور چاقو کو دس کے نوٹ میں لپیٹ کر جیب میں رکھا اور فلمی اداکار کی تصویر بغل میں دبا کر بھاگ گیا۔ یہ دیکھ کر اُس کا بھائی چلّا اُٹھا۔

"او مائی گاڈ! یہ تو سیاست دان بنے گا"

سید زبیر علی شاہ عرف ببر میاں ڈھیری، ہزارہ

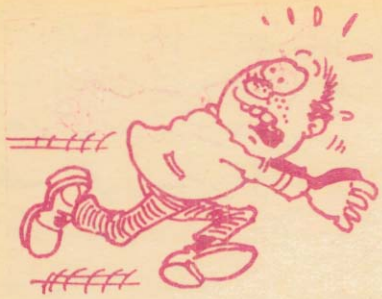

ایک عورت گداگر سے: "گھر گھر جا کر بھیک مانگتے تمہیں شرم نہیں آتی"

گداگر: "جی کیا کروں۔ میرے گھر آکر کوئی دیتا ہی نہیں"

جمشید احمد ، کراچی

دماغی اسپتال میں ایک مریض کا دعویٰ تھا کہ وہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا بیٹا ہے۔ آخر اس کا آپریشن کر دیا گیا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ ڈاکٹر نے مسکرا کر پوچھا "اب تو تم لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے بیٹے نہیں ہو؟" "جی نہیں...... میں بھول گیا تھا میں دراصل لیڈی ماؤنٹ بیٹن کا بیٹا ہوں۔"

ثنا محمد نصر اللہ۔ سائٹ کراچی

باپ:۔ (بیٹے سے) "کیوں بیٹا پیدل چلیں یا کسی سواری پر؟"

بیٹا:۔ (معصوم صورت بناتے ہوئے) "آپ کی مرضی، ویسے اگر پیدل چلنا ہو تو مجھے گود میں اٹھا لیں۔" عباس علی شاہ...... بن قاسم کراچی

نوکر کنجوس مالک سے۔ "جناب میں پانچ سال سے ملازم ہوں اور میں نے ہمیشہ تین آدمیوں کا کام کیا آپ میری تنخواہ نہیں بڑھائیں گے۔"

مالک۔ "بھئی میں اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے ان دو آدمیوں سے بھی بات کرنی ہے جن کا تم کام کرتے ہو۔"

افتخار حسین خان..... اوکاڑہ

مہمان "آپ کا نوکر برابر سیٹی بجائے جا رہا ہے۔ اسے آداب محفل کا کچھ پتہ نہیں۔"

کنجوس میزبان۔ "یہ میرا ہی حکم ہے۔ اس سے مجھے اطمینان رہتا ہے کہ وہ کچھ کھا پی نہیں رہا۔"

علی نذیر اعوان..... لاہور

ایک عورت اپنے شوہر کی تصویر لے کر فوٹو گرافر کے پاس گئی اور کہنے لگی۔ "میرے شوہر نے یہ تصویر ٹوپی پہنے کھنچوائی ہے جبکہ میں نے کہا تھا کہ بغیر ٹوپی کے کھنچوانا۔ آپ کسی طرح یہ ٹوپی ہٹا سکتے ہیں؟"

فوٹو گرافر بولا، "جی بالکل لیکن یہ تو بتائیے کہ آپ کے شوہر الٹی مانگ نکالتے ہیں یا سیدھی۔"

عورت بولی، "جب آپ ٹوپی اتاریں گے تو خود ہی پتہ چل جائے گا۔"

(نامعلوم)

ہیڈ مس نے اسمبلی کے وقت تمام بچوں سے کہا کہ دعا کریں کہ تمام بیمار صحت یاب ہو جائیں ایک بچی خاموش کھڑی تھی۔ ہیڈ مس نے پوچھا۔

"کیوں بیٹی آپ کیوں دعا نہیں کرتیں کیا آپ نہیں چاہتیں کہ تمام بیمار صحت یاب ہو جائیں۔"

بچی نے جواب دیا، "اگر تمام بیمار ٹھیک ہو گئے تو میرے ابو کیا کریں گے۔ کیونکہ وہ ایک ڈاکٹر ہیں۔"

ریحان احمد..... کراچی

ایک مقرر کی تقریر بہت لمبی ہو گئی سامعین نے اکتاہٹ کا اظہار کیا مقرر فوراً سمجھ گیا اور بولا "میں یہ باتیں آپ کی آئندہ نسلوں کی بھلائی کے لئے کہہ رہا ہوں۔" ایک شخص نے یہ سن کر جواب دیا "آپ تقریر جاری رکھیں ہماری آئندہ نسلیں یہاں پہنچنے والی ہیں۔"

شفیق الرحمٰن..... حیدر آباد

جتنا گڑ اتنا میٹھا

محمد جاوید خالد

سیما پڑھائی میں ویسے تو ٹھیک تھی لیکن حساب اور انگریزی اس کے بس کے نہ تھے۔ شاید بس میں آبھی جاتے اگر وہ جی لگا کر محنت کرتی مگر جی محنت میں کیسے لگتا، وہ تو لگتا تھا لوڈو میں، آنکھ مچولی میں یا محلّے کی لڑکیوں کے ساتھ گڈے گڑیا کی شادی میں۔ بششماہی امتحان کا نتیجہ نکلا تو سیما توقع کے عین مطابق حساب اور انگریزی میں فیل تھی اور ان دونوں اہم پرچوں میں فیل ہونے کی وجہ سے مجموعی طور پر بھی فیل قرار دے دی گئی۔ دو ایک روز تو سیما کو افسوس ہُوا اور وہ کتابیں لئے رات گئے تک پڑھنے بھی لگی مگر اِدھر بات پرانی ہوئی اُدھر سیما کی پُرانی مصروفیات پھر شروع ہوگئیں۔

اگرچہ نتیجہ ششماہی امتحان کا تھا اور پانچویں جماعت بھی کوئی بڑی جماعت نہ تھی مگر سیما کے والدین کو فکر ہوئی اور سیما کو ٹیوشن پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر صاحب کو مقرر کیا گیا۔ ماسٹر صاحب کی مسلسل محنت سے سیما کی تعلیمی حالت قدرے بہتر ہوگئی۔ مگر اب بھی اس کا زیادہ وقت فضول کاموں ہی میں گزرتا۔ سیما کو پڑھانے کے

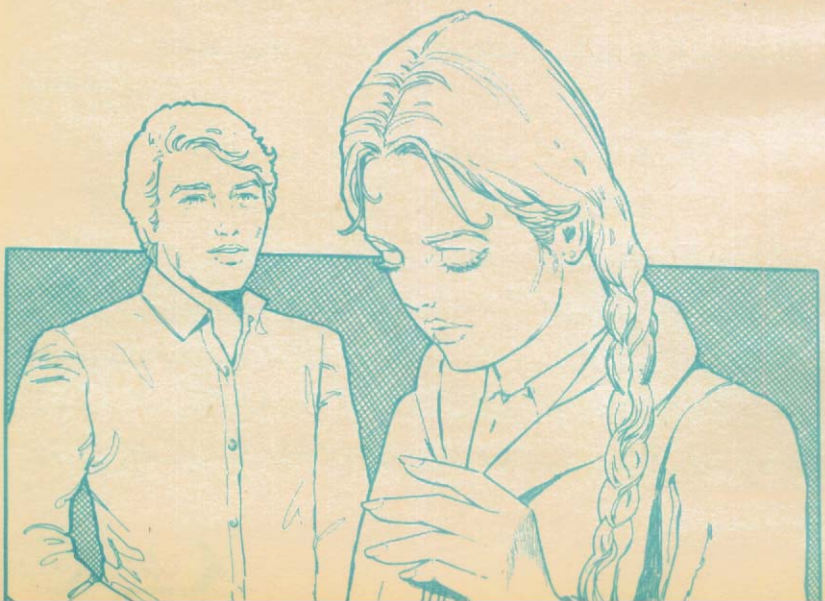

لیئے ماسٹر صاحب نے شام چھ بجے سے سات بجے تک کا وقت مقرر کر رکھا تھا۔ چھٹی سے پانچ سات منٹ پہلے سیما اجازت لے کر اُٹھ جاتی اور اپنے والدین کی ہدایت کے مطابق جلدی سے چائے تیار کر کے ماسٹر صاحب کو پیش کرتی۔ چائے پیتے ہوئے وقت پورا ہو جاتا اور ماسٹر صاحب "خدا حافظ" کہہ کے روانہ ہو جاتے۔ جس طرح ان کے جانے کا وقت مقرر تھا اسی طرح وہ آنے میں بھی وقت کے سخت پابند تھے۔ اور سیما کو ان کے آنے کے بعد ایک منٹ بھی ضائع کرنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ ماسٹر صاحب نے کہہ رکھا تھا کہ وہ اُن کے آنے سے پہلے ہی کتابیں کاپیاں لے کر تیار بیٹھا کرے مگر اُس روز تو عجیب بات ہو گئی۔ ماسٹر صاحب کو آ کے بیٹھے پورے پانچ منٹ ہو گئے۔ اور سیما پڑھنے نہیں بیٹھی۔ اس کی کچھ سہیلیاں اُس کے ہاں آئی ہوئی تھیں۔ جن کے ساتھ وہ دوسرے کمرے میں جانے کیا کر رہی تھی۔

"سیما!" ماسٹر صاحب نے گھڑی دیکھتے ہوئے اُسے آواز دی۔

"بس سر!! ابھی آئی" سیما وہیں سے چلائی۔

ماسٹر صاحب غصّے سے پہلو بدل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد سیما نمودار ہوئی۔ جوش سے اس کا چہرہ سُرخ ہو رہا تھا۔ ماسٹر صاحب کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ بول پڑی۔

"سر!! میں نے پوری جماعت میں پوزیشن لی ہے۔ روبی صرف پاس، نوشی ترقی پاس اور مریم فیل" اُس نے پھولی ہوئی سانسوں سے کہا۔

ماسٹر صاحب حیرانی میں اپنا غصّہ بھی بھول گئے۔

مگر۔۔۔۔ انہوں نے حیران ہوتے ہوئے کہا "امتحان کب ہوئے۔ میرے علم کے مطابق تو تمھارے امتحان میں ابھی تین مہینے باقی ہیں"۔

"نہیں سر! امتحان نہیں ہوئے" سیما کی سانس مارے جوش کے ابھی تک پھولی ہوئی تھی۔

"پھر تم پاس کیسے ہو گئیں؟ پوزیشن کیسے بن گئی؟" ماسٹر صاحب اب بھی حیران تھے۔

"وہ اس طرح سر!" سیما نے وضاحت کی۔ "میں نے روبی، نوشی اور مریم نے ایک چارٹ بنایا۔ اس میں تینوں پوزیشنیں، پاس، ترقی پاس اور فیل کے خانے تھے۔ پھر ہم نے باری باری آنکھیں بند کر کے اس چارٹ پر انگلی رکھی۔ مریم بے چاری کی انگلی فیل کے خانے میں لگی۔ نوشی کی ترقی پاس میں اور روبی پاس ہو گئی۔ میری فرسٹ پوزیشن آئی ہے۔ سر! آپ دیکھئے گا اسی طرح ہو گا۔ ششماہی امتحان میں بھی ہم نے یہ کیا تھا تو میں فیل ہو گئی تھی۔ اسی لئے تو سر مجھے پہلے سے پتا تھا کہ میں ششماہی امتحان میں فیل ہو جاؤں گی" اُس نے پُر یقین لہجے میں بڑی رازداری

سے کہا۔

"تمہارے امّی، ابّو کہاں ہیں؟" ماسٹر صاحب نے ساری بات سمجھ کر سوال کیا۔

"وہ تو ماموں جان کے ہاں گئے ہیں۔" سیما نے بتایا۔

ماسٹر صاحب کے لئے یہ بڑا مشکل وقت تھا۔ سیما کے ذہن میں ایک غلط بات نے جگہ بنالی تھی۔ وہ اگر سختی سے اُسے ڈانٹ کر پڑھائی کی طرف متوجہ کرتے تو وہ ایسا کر تو لیتی لیکن وہ غلط بات اس کے ذہن سے نہ نکلتی اور ماسٹر صاحب کے جانے کے بعد اس کی توجہ پھر کھیل کُود کی جانب لگ جاتی۔ ماسٹر صاحب نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بس "ہُوں" کہہ کر سر ہلایا اور کتاب کھولتے ہوئے کہا

"لائیے! ہوم ورک کیا ہے؟"

"سر! تھوڑا سا باقی ہے" سیما نے کاپی کھول کر ڈرتے ڈرتے کہا۔

ماسٹر صاحب نے اب بھی کچھ نہ کہا۔ جتنا ہو گیا تھا اُسے چیک کیا اور آگے پڑھانا شروع کر دیا۔ چھٹی سے کچھ دیر پہلے معمول کے مطابق سیما نے چائے کے لئے اجازت چاہی تو ماسٹر صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ آج دیر سے پڑھنے بیٹھنے کی وجہ سے جلدی چھٹی نہیں ہوگی۔ ٹھیک سات بجے انہوں نے کتابیں بند کیں اور خدا حافظ کہتے ہوئے چل دیئے۔ سر کے بغیر چائے پیئے جانے کا سیما کو افسوس ہُوا مگر پوزیشن کی خوشی اس افسوس پر غالب آگئی۔

اگلے روز ماسٹر صاحب پھر اپنے وقت پر آگئے۔ سیما کی نالائقی دیکھو کہ آج اُس نے تھوڑا سا بھی ہوم ورک نہیں کیا تھا۔ ماسٹر صاحب کو غصّہ تو آیا مگر انہوں نے اُسے کوئی سزا نہیں دی اور آگے پڑھانا شروع کر دیا۔ آج سیما نے پڑھائی میں بھی کچھ زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ماسٹر صاحب جانتے تھے کہ اس کے ذہن میں یہ خیال پُختہ ہو گیا ہے کہ وہ پڑھے نہ پڑھے امتحان میں پہلی پوزیشن سے کامیاب ہو جائے گی۔

چھٹی کے وقت سیما نے چائے کے لئے اجازت چاہی تو آج پھر ماسٹر صاحب نے منع کرتے ہوئے کہا۔

"چائے آجائے گی۔ تم کام پورا کرو۔" اور اپنے مقررہ وقت پر وہ آج بھی چائے پیئے بغیر چلے گئے۔ دوسرے دن بھی جب چائے کی اجازت کے جواب میں ماسٹر صاحب نے یہی کہا "چائے آجائے گی تم کام پورا کرو" تو سیما نے کتاب بند کر دی اور کہا۔

"سر! آپ مجھے ایک بات بتائیں میں یہاں بیٹھی پڑھ رہی ہوں۔ چولھا بند پڑا ہے۔ چائے کا برتن خالی ہے۔ پتّی اور چینی اپنے اپنے ڈبّوں میں ہیں۔ جب میں اُٹھ کر چائے بنانے جاؤں گی نہیں تو چائے کیسے آجائے گی؟"

ماسٹر صاحب دھیرے سے مسکرائے اور بولے: "بالکل اسی طرح جیسے تمہاری پڑھائی میں دلچسپی نہ لینے اور ہوم ورک نہ کرنے کے باوجود امتحان میں پوزیشن آجائے گی۔"

پہلے تو سیما کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ مگر پھر جیسے ایک دم سورج نکل آیا ہو اور سیما اندھیروں سے روشنی میں آگئی ہو۔ بات اُس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ شرمندگی کے مارے وہ کتنی ہی دیر چُپ بیٹھی رہی۔ آخر گردن جھکائے جھکائے ہی اُس نے کہا... "سوری سر۔"

"کوئی بات نہیں۔" ماسٹر صاحب جیسے اُس کے "سوری" کہنے کے انتظار ہی میں بیٹھے تھے۔

"کوئی بات نہیں۔" انہوں نے کہا: "اب اس شرمندگی کے دُور کرنے کا علاج یہی ہے کہ تم خوب محنت کرو اور سچ مچ امتحان میں پوزیشن لے لو۔"

"جی" سیما بس اتنا ہی کہہ سکی۔

اگلے دن سیما نے پورا ہوم ورک کیا ہُوا تھا۔ اور وہ پڑھنے بیٹھی تو پڑھائی کے علاوہ اُسے کچھ سُوجھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ تو اُس وقت چونکی جب ماسٹر صاحب نے گھڑی دیکھ کر مُسکراتے ہوئے کہا: "کیوں بھئی سیما! آج چائے نہیں ملے گی؟"

سیما نے سر اُٹھا کر گھڑی دیکھی اور "ارے" کہہ کر ایک دم باورچی خانے کی طرف دوڑی۔ جب سے اُس نے ماسٹر صاحب سے پڑھنا شروع کیا تھا پہلی بار ایسا ہُوا تھا کہ گھڑی نے اُس کے دیکھنے سے پہلے سات بجا دیئے تھے۔ پھر تو روز ہی ایسا ہونے لگا۔ ماسٹر صاحب بھی خوشی خوشی زیادہ وقت دینے لگے۔ امتحان ہوئے اور پھر چھٹیاں ہو گئیں۔

ماسٹر صاحب ڈیوٹی سے گھر آئے تو پتا چلا کہ سیما اور اُس کی والدہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے اُن کا انتظار کر رہے ہیں۔ انہوں نے دروازے پر قدم رکھا ہی تھا کہ سیما تیزی سے اُٹھی۔

"سر! سر!" اُس نے جلدی جلدی کہنا شروع کیا "امتحان کی فرسٹ پوزیشن نتیجہ..." خوشی کے مارے اُس کے منہ سے الفاظ بھی اُلٹے سیدھے نکل رہے تھے۔

"بے وقوف لڑکی" اُس کی ماں نے اُسے ڈانٹا۔ "پہلے ماسٹر صاحب کو سلام کرو اور پھر آرام سے ٹھہر ٹھہر کر بات کرو۔"

"بالکل نہیں۔" ماسٹر صاحب فوراً بولے۔ آپ سیما کو بالکل نہیں ڈانٹ سکتیں۔ سیما بہت اچھی اور عقل مند لڑکی ہے۔ میں نے سیما کی ساری بات سمجھ لی ہے۔ کیوں بھئی امتحان کا نتیجہ نکل آیا اور تم نے فرسٹ پوزیشن لی ہے۔ یہی

بات ہے نا؟"

"جی ہاں! جی ہاں!" سیما نے زور زور سے سر ہلایا۔

ماسٹر صاحب نے جھک کر اُس کی پیشانی چوم لی۔ اُسے شاباش دی پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

"سیما! تم چائے بنانے میں تو ماہر ہو بہت"

"جی سر!" سیما فوراً بولی "ابھی بنا کر لاتی ہوں" یہ کہا اور دروازے کی طرف بھاگی مگر پھر ایک دم رُک گئی۔

"کیا ہُوا؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

"یہ تو آپ کا گھر ہے" سیما نے آہستہ سے جواب دیا۔

"تو کیا ہُوا؟" ماسٹر صاحب نے ہنستے ہُوئے کہا "تم یہاں بھی چائے بنا سکتی ہو لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا کہ چائے بناتے وقت تم نے دیکھا ہے کہ اگر شکر کم ڈالی جائے تو چائے پھیکی ہوگی اور شکر کی مقدار بڑھا دیں تو۔"

"چائے میٹھی ہوگی" سیما نے فوراً فقرہ پورا کر دیا۔

"بالکل!" ماسٹر صاحب نے کہا "جتنی شکر ڈالیں گے اُتنا میٹھا ہوگا اسی طرح جتنی محنت زیادہ ہوگی اتنا نتیجہ اچھا آئے گا"

آنکھ مچولی ـــــ تحریری مباحثہ

تبصرے، تجزیئے اور اظہارِ رائے کی صلاحیت کو فروغ دینے کے لئے ماہنامہ آنکھ مچولی طلبا و طالبات کے مابین ایک تحریری مباحثے کے انعقاد کا اعلان کرتا ہے۔۔

مباحثے کی قرارداد یہ ہے

"لڑکیاں والدین کی زیادہ فرمانبردار ہوتی ہیں"

طالبات قرارداد کے حق میں اور طلبا اس کی مخالفت میں اپنے اپنے دلائل، خوبصورت اور مختصر تقریری شکل میں تحریر کر کے ۱۵ فروری تک بھجوا دیں اوّل، دوم اور سوم آنے والوں کو تین بہترین انعام دیئے جائیں گے۔ جبکہ بقیہ خوبصورت تحریریں وقتاً فوقتاً شائع کی جاتی رہیں گی۔

تحریری مباحثہ :- ماہنامہ آنکھ مچولی، ۱۱۲- ڈی، سائٹ کراچی ۱۶

علم و ادب کے فروغ میں جو ادارے "آنکھ مچولی" سے تعاون کر رہے ہیں ان کی تعداد بے شمار ہے۔ اس صفحے پر ہم صرف اُن بڑے ایجنٹس کی فہرست دے رہے ہیں جن کی کوششوں سے ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے دُور دراز علاقوں تک بڑی تعداد میں پہنچتا ہے۔

آنکھ مچولی کے ایجنٹس

پاکستان بھر میں

محمد حسین برادرز۔ کراچی فون:۔ ۷۲۳۹۵۵	پاکستان اسٹینڈرڈ بک اسٹال۔ سرگودھا فون:۔ ۶۲۹۵۱
سلطان نیوز ایجنسی۔ لاہور فون:۔ ۵۸۲۴۹	کیپٹل نیوز ایجنسی۔ بہاولپور فون:۔ ۲۹۵۷
ملک تاج محمد صاحب۔ راولپنڈی فون:۔ ۵۵۴۳۲۱ / ۸۴۷۹۸۶	طاہر نیوز ایجنسی۔ جہلم فون:۔ ۰۵۹۴۱
مہران نیوز ایجنسی۔ حیدر آباد فون:۔ ۲۰۱۲۸	چوہدری امانت علی اینڈ سنز۔ رحیم یار خان فون:۔ ۲۶۲۶
افضل نیوز ایجنسی، چوک یادگار، پشاور فون:۔ ۶۲۵۱۵ / ۶۲۷۵۱	وہاڑی نیوز ایجنسی۔ ریل بازار وہاڑی
اے ایس حامد نیوز پیپر سروس، ملتان فون:۔ ۴۳۳۱۰ / ۴۱۷۵۷	اسلم نیوز ایجنسی۔ اخبار گھر۔ گوجرانوالہ
فیاض بک ڈپو۔ فیصل آباد فون:۔ ۲۷۴۰۶	اشرف نیوز ایجنسی۔ بالمقابل جی ٹی ایس بس اسٹینڈ۔ اوکاڑہ
سعید بک اسٹال۔ گجرات فون:۔ ۰۴۳۳۱	مسلم بک ڈپو۔ سرائے عالمگیر
سلمان برادرز۔ نواب شاہ فون:۔ ۲۴۱۴	

رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں یا بروقت نہ ملنے پر مندرجہ ذیل پتے پر خط لکھئے

سرکولیشن مینیجر

"ماہنامہ آنکھ مچولی" ڈی ۱۱۲، نورس روڈ، سائٹ کراچی ۱۶

سائنس انکوائری

سائنسی موضوعات پر
آپ کے سوالات اور ان کے جوابات

سید ایاز محمود

● راکٹ جب چاند پر جانے کے لئے اُڑتا ہے تو اُس کو پریشر کی ضرورت ہوتی ہے اور جب راکٹ چاند سے زمین کی طرف آتا ہے تو کیا جب بھی اس کو پریشر کی ضرورت ہوتی ہے اور کیا اس میں اتنی ہیٹ HEAT ہوتی ہے کہ وہ چاند سے زمین کی طرف آئے ؟ تفصیل سے بیان کیجئے۔

نیز یہ بھی بتائیے کہ جب راکٹ زمین سے چاند کی جانب جاتا ہے تو اس کا رُخ اوپر کی طرف ہوتا ہے۔ اور جب وہ چاند پر اُترنے لگتا ہے۔ تو کس طرح اُترتا ہے ؟ اور جب راکٹ چاند پر اُترتا ہے تو وہاں پر خلاء ہوتی ہے اور وہاں ہر چیز کا وزن گھٹ جاتا ہے مگر راکٹ کیوں ایک جگہ ٹھہرا رہتا ہے اور چاند گاڑیاں خلا میں معلق کیوں نہیں ہوتیں ؟ اس کا سبب بتائیے (عدنان محمود صدیقی، لطیف آباد حیدرآباد)

عدنان صاحب ! آپ نے یہ کیا کیا۔؟ ایک ہی قسط میں آپ کے اتنے سارے سوالات کے جواب دینا ہمارے لئے ممکن نہیں۔ آپ اور ہمارے دوسرے ساتھی بھی نوٹ کرلیں اور آئندہ براہِ کرم ایک وقت میں ایک ہی سوال بھیجیں۔

آپ نے راکٹ اور اس کے چاند کے سفر کے متعلق کئی سوالات کئے ہیں۔ اس کا تفصیلی جواب تو ہم آپ کو آئندہ انشاء اللہ کسی مضمون کی صورت میں دیں گے۔ اس وقت مختصراً یہ سمجھ لیجئے کہ راکٹ کو زمین کی کشش سے نکلنے کے لئے کم از کم ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار کی ضرورت ہوتی۔ اتنی رفتار حاصل کرنے کے بعد کئی مرحلے طے کرتا ہُوا راکٹ زمین کے مدار سے نکل کر چاند کے مدار میں بن بُلائے مہمان کی طرح داخل ہوجاتا ہے اور اور چاند کی کشش کے زیرِ اثر کسی مصنوعی سیارے

کی طرح چاند کے گرد چکر کاٹنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ایک اور مرحلے میں چاند گاڑی والا حصہ راکٹ سے علیحدہ ہو کر چاند پر جا اُترتا ہے۔ آپ نے پوچھا ہے کہ چاند کی سطح پر چاند گاڑی خلاء میں معلق کیوں نہیں ہو جاتی۔ تو بھائی آخر آپ سے کس نے کہہ دیا کہ چاند پر بالکل بے وزنی کی کیفیت ہے۔ چاند بہر حال ایک بہت بڑا جسم ہے اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر مادّی شے اپنے اندر کشش رکھتی ہے۔ چاند کی بھی اپنی کشش ہے۔ ہمارے سمندر میں مدوجزر اسی کی بدولت ہے۔ چاند زمین کی نسبت چھوٹا ہے اور اس کی تناسب سے اس کی کشش ثقل بھی زمین کے مقابلے میں کم ہے۔ اندازہ لگائیے...!

اگر آپ پانچ فٹ اونچی چھلانگ لگا سکتے ہیں تو چاند پر چھ گنا یعنی ۳۰ فٹ اونچی چھلانگ بآسانی لگا سکیں گے۔ لیکن یہ نہیں کہ معلق ہی ہو جائیں۔

● کمپیوٹر کیسے کام کرتا ہے۔ کیا یہ بات صحیح ہے کہ کمپیوٹر ماضی اور مستقبل کی باتیں بتانے کی صلاحیت رکھتا ہے؟ (راجہ راشد بشیر۔ گرومندر کراچی)

بہت سے لوگوں کی طرح شاید آپ بھی یہ سوچتے ہوں کہ کمپیوٹر کا اپنا کوئی ذہن ہوتا ہے وہ سوچ سکتا ہے اور بعض نوعیت کے فیصلے از خود کر سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے۔ کمپیوٹر کا کام تو بس اتنا ہے کہ وہ اپنے اندر محفوظ شدہ اطلاعات کو طلب کرنے پر

بہت تیز رفتاری اور قطعی درستگی کے ساتھ فراہم کردے۔ کیلکولیٹر کے استعمال سب ہی واقف ہیں۔ کمپیوٹر بنیادی طور پر ایک بڑا اور تیزی سے کام کرنے والا کیلکولیٹر ہی ہے جو کہ اطلاعات اور معلومات کے ایک بہت بڑے ذخیرے کو اپنے اندر محفوظ رکھتے ہوئے مطلوبہ اطلاعات بہت کم وقت میں مہیا کر سکتا ہے۔

کمپیوٹر کا کام یہ بھی ہے کہ وہ اطلاعات کو منطقی ترتیب کے ساتھ پیش کرے۔ لیکن یاد رکھیے۔ کمپیوٹر کی کوئی اپنی منطق نہیں ہوتی بلکہ یہ اُسے سکھائی گئی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر ہم یہ چاہیں کہ ایک جماعت میں موجود بچوں کی ایک ایسی لسٹ تیار کی جائے جس کی ترتیب بہ لحاظِ عمر ہو، یعنی سب سے کم عمر بچے کا نام لسٹ میں سب سے پہلے آئے اور اُسی ترتیب سے سب سے آخر میں اس بچے کا نام آئے جس کی عمر جماعت میں سب سے زیادہ ہے۔ کمپیوٹر ہمارا یہ کام بہ آسانی کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ہمیں اس کی یادداشت میں تمام بچوں کے نام اور اُن کی عمروں کو داخل کرنا پڑے گا۔ اس کے بعد ہم کمپیوٹر کو منطقی ہدایات دیں گے کہ فراہم کردہ ترتیب بہ لحاظِ عمر ہو۔ کمپیوٹر کو کوئی بھی ہدایت اُسی کی زبان میں دی جاتی ہے (دنیا میں کمپیوٹر کی کئی زبانیں رائج ہیں) ہدایت دینے کے اس عمل کو "کمپیوٹر پروگرامنگ" کہتے ہیں جو لوگ ان زبانوں میں مہارت رکھتے ہیں وہ اپنی ضروریات کے مطابق ایک پروگرام کے ذریعے کمپیوٹر کو مختلف ہدایات دے سکتے ہیں۔

آپ یقیناً سمجھ گئے ہوں گے کہ کمپیوٹر کی کارکردگی کا تمام تر انحصار اس کو فراہم کردہ اطلاعات اور اس کو دی گئی ہدایات Commands پر ہوتا ہے غلط اطلاعات کی فراہمی کی صورت میں کمپیوٹر جواب بھی غلط دے گا۔

آج کا دور بلاشبہ کمپیوٹر کا دور ہے یہ انسانوں کی سہولت کے لئے ہے اور انسانوں ہی کے حکم کا تابع۔

● مُشک کیا ہے؟ کہاں پائی جاتی ہے؟ اور اتنی خوشبودار کیوں ہوتی ہے؟

فارسی کی ایک مثل ہے۔ جس کا ترجمہ ہے کہ "مُشک کی خوشبو ہی خود اس کی پہچان ہے عطّار کو بتانے کی ضرورت نہیں"۔

مُشک کی خوشبو اپنی اعلیٰ خصوصیات کی بناء پر نہ صرف تاریخی حیثیت رکھتی ہے بلکہ آج بھی ساری دنیا میں مشہور و معروف ہے۔ مشک کا ذکر کلامِ پاک میں بھی ملتا ہے۔

یہ خوشبو تبت، چین اور ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں پائے جانے والے ہرن کے نافے سے حاصل کی جاتی ہے۔ ہرنوں کی یہ مخصوص قسم بھُورے رنگ کی ہوتی ہے اور اس کے جسم پر سفید دھبے پائے جاتے ہیں۔ یہ چونکہ اُونچے پہاڑوں پر رہتا ہے اس لئے بہت مشکل سے ہاتھ آتا ہے۔ ایک ہرن سے حاصل کردہ مشک زیادہ سے زیادہ دو اونس تک ہوتی ہے۔ یہ بات

بھی قابلِ ذکر ہے کہ مُشک صرف نر ہرن میں پائی جاتی ہے مُشک بادشاہوں اور امیر و کبیر لوگوں کی من پسند خوشبو رہی ہے۔ اپنی خصوصیات اور کمیابی کی وجہ سے یہ بہت مہنگی فروخت ہوتی ہے۔

◆ سچے موتی کیسے بنتے ہیں؟

امتل کاظمی، سرلئے عالمگیر

کبھی اتفاق سے اگر ریت کا کوئی ذرّہ سیپ کے خول کے اندر چلا جائے تو وہ وہاں پہنچ کر سیپ کی اندرونی جھلّی کو زخمی کر دیتا ہے اور اس کی تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ اس تکلیف سے نجات پانے کے لئے سیپ ایک رقیق مادہ پیدا کرتی ہے جو ریت کے ذرّہ کے گرد جم جاتا ہے۔ سیپ تو یہ کارروائی اس لئے سرانجام دیتی ہے کہ اُسے ریت کے ذرّہ کی چُبھن سے نجات ملے لیکن دوسری طرف یہی مادہ جم کر موتی بن جاتا ہے جسے بعد میں نکال کر زیورات وغیرہ میں استعمال کیا جاتا ہے۔

جاپان کے لوگ زمانۂ قدیم میں بھی اس بات سے واقف تھے۔ لہٰذا آج بھی جاپان میں لوگ باقاعدہ سیپیاں پالتے ہیں۔ پالے جانے والی سیپ کے منہ کو کھول کر اس کے اندر چھوٹی سی گولی رکھ دی جاتی ہے۔ اب سیپ کو لوہے کے پنجروں میں بند کر کے سمندر میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے چار پانچ سال کے اندر سیپ گولی کے اوپر ایک خول چڑھا لیتی ہے جسے سُچا موتی کہہ کے بازار میں بیچا جاتا ہے۔

بعض حالات میں مختلف کیڑے کسی نہ کسی طرح سیپی کے اندر گھس جاتے ہیں اور اُسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ سیپی اسی طرح تکلیف کا تدارک کرنے کے لئے رقیق مادے سے کیڑے کے گرد خول بنا لیتی ہے۔ جو سچا موتی کہلاتا ہے۔

◆ کیا وجہ ہے کہ جب آپ کسی چلتی ٹرین سے چھلانگ لگاتے ہیں تو کچھ دیر اُسی سمت کو حرکت کرتے ہیں جس طرف ٹرین کا رُخ ہوتا ہے؟

نواز بلوچ سُربندر، گوادر

بھائی آپ کو کیسے خیال ہُوا کہ ہم اس قسم کی حرکت کرتے ہیں۔ یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ کسی بھی چلتی ہوئی سواری سے اُترنے سے پہلے یہ اطمینان کر لینا چاہئے کہ وہ ٹھہری ہوئی ہو۔ چل نہ رہی ہو۔ یہ تو ہوئی ایک بات۔ اب آئیے اپنے سوال کی طرف۔

ہم اور آپ جب کسی سواری میں بیٹھے محوِ سفر ہوتے ہیں تو ہمارے جسم بھی سواری کے ساتھ حرکت کر رہے ہوتے ہیں۔ چلتی ہوئی سواری سے اُترنے کی صورت میں جسم چونکہ کچھ ہی دیر پہلے حرکت میں تھا۔ لہٰذا ایک دم سے نہیں رُک پاتا بلکہ اسی سمت میں حرکت کرتا رہتا ہے۔ نتیجتہً ہم کچھ دیر تک ناک کی سیدھ میں بھاگتے ہیں پھر زور لگا کر رُک جاتے ہیں۔

آگے حرکت کرنے کا یہ عمل قُدرتی عمل ہے اور ہمیں توازن قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن پھر وہی بات جو ہم نے پہلے کہی تھی کہ آخر چلتی ہوئی سواری سے اُترنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس میں ہمیشہ چوٹ کا خطرہ رہتا ہے اور کوئی غلطی سے مخالف سمت رُخ کر کے کُود پڑے تو پھر اُس کا اللہ ہی حافظ ہے۔

بارہ دن میدانِ جنگ میں

ضربِ مومن کا آنکھوں دیکھا حال

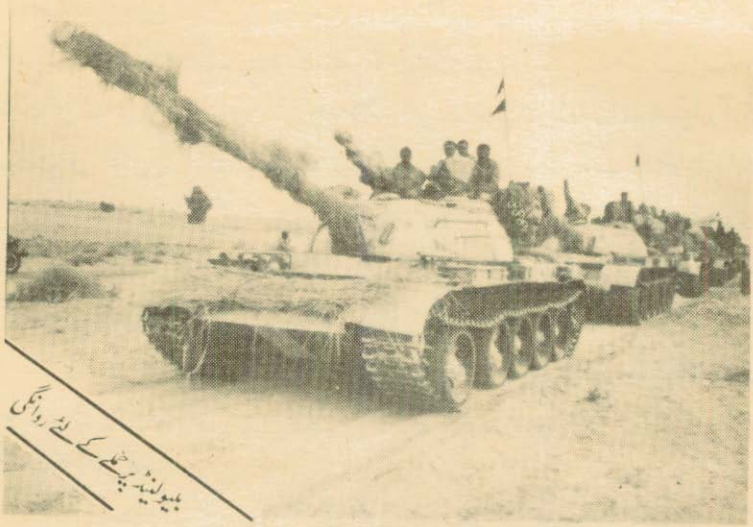

بیلولینڈ پر حملے کے لئے روانگی

طاہر مسعود

دسمبر کی ایک صبح میں اخبار میں یہ پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ فاکس لینڈ نے بیلولینڈ پر حملہ کر دیا ہے اور دونوں فوجوں میں گھمسان کی جنگ ہو رہی ہے۔ اسی شام ریڈیو سے خبر نشر ہوئی کہ فاکس لینڈ کے طیاروں نے بیلولینڈ کے فلاں فلاں شہروں پر زبردست بمباری کی۔ میں حیران تھا کہ یہ دونوں ممالک دنیا کے کس خطے میں واقع ہیں اور یہ اچانک کہاں سے معرضِ وجود میں آگئے کیونکہ دنیا کے نقشے پر تو ان کا کہیں کوئی سراغ نہیں ملتا تھا۔ ذرا سی تحقیق پر کھلا کہ پاکستان کی مسلح افواج اپنی جنگی مہارت آزمانے کے لئے فوجی مشقیں کر رہی ہیں۔ اور یہ مشقیں اس لئے کی جاتی ہیں تاکہ یہ دیکھا جا سکے کہ مسلح افواج نے اپنے ملک کی بقاء اور حفاظت کے لئے اب تک جو تیاریاں کی ہیں وہ کس حد تک اطمینان بخش ہیں۔ یعنی دشمن ملک اگر اچانک حملہ آور ہو جائے تو ہماری فوجیں اپنے وطن کا دفاع کس طرح کریں گی۔ ہماری فوج کے پاس جو ہتھیار، ٹینک، توپ اور گولہ بارود ہیں وہ کتنے کار آمد ہیں، ہمارے فوج جنرلوں کی دفاعی اسٹریٹجی میں کتنی قوت اور جان ہے۔ ظاہر ہے ان ساری چیزوں کو جاننے کے لئے

فوج کی پیشہ ورانہ اہلیت کو جانچنا ضروری ہوتا ہے اس لئے فوجی مشقیں بھی ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے کوئی ٹیم اپنے کھلاڑیوں کی کارکردگی کو پرکھنے کے لئے اصل میچ سے پہلے آزمائشی میچ کھیلتی ہے۔

ہماری مسلح افواج کے تقریباً دو لاکھ جوان ان مشقوں میں حصہ لے رہے تھے اور اس مقصد کے لئے دو فرضی ممالک بنائے گئے تھے۔ فاکس لینڈ رقبے اور وسائل کے اعتبار سے ایک بڑی طاقت تھی جسے اندرونی سطح پر سیاسی مسائل کا سامنا تھا۔ اس کے مقابلے میں بلیولینڈ ایک چھوٹی اور کمزور ریاست تھی۔ فاکس لینڈ نہایت عیاری سے اپنے مسائل سے عوام کی توجہ ہٹانے کے لئے بلیولینڈ پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ بلیولینڈ کی مٹھی بھر جانباز افواج اس جارحیت سے اپنے وطن کو بچانے کے لئے میدان جنگ میں کود پڑتی ہیں اور ایک ایک انچ مٹی کی دفاع میں سیسہ پلائی دیوار بن جاتی ہیں۔ جنگ آہستہ آہستہ پھیلتی جارہی تھی اخبارات روزانہ تازہ ترین جنگی صورتحال کی خبریں شائع کر رہے تھے۔

پاکستان کے کروڑوں عوام کی طرح میں بھی اس جنگ میں گہری دلچسپی لے رہا تھا۔ میری ہمدردیاں بلیولینڈ کے ساتھ تھیں اور میں ایک امن پسند شہری کی حیثیت سے فاکس لینڈ کی بدترین شکست کا خواہاں تھا۔

اس رات اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا دوسری طرف ہماری مسلح افواج کے محکمہ تعلقات کے خوش گفتار خوش اطوار میجر صولت رضا تھے۔

"جنگ چھڑ چکی ہے، تم گھر میں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟" انہوں نے کہا۔

"بلیولینڈ کی کامیابی کی دعائیں مانگ رہا ہوں۔"

"کیا تم میدان جنگ میں جانا پسند نہیں کرو گے؟"

"لیکن میں بندوق چلانا نہیں جانتا۔"

یہ سن کر میجر صولت ہنسے۔ "بھئی تمہیں لڑنا وڑنا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم نے تمہارا نام ان صحافیوں میں شامل کر لیا ہے جو محاذ جنگ پر بھیجے جارہے ہیں تاکہ اپنی آنکھوں سے لڑائی کا حال دیکھ سکیں۔"

"ہاں مگر میں ابھی سے واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میں بلیولینڈ کے ساتھ ہوں۔"

"دفاعی نامہ نگار غیر جانبدار ہوتے ہیں اور تمہیں بھی غیر جانبدار رہنا چاہئے۔"

"غیر جانبداری مصلحت پسندی کا دوسرا نام ہے۔" میں نے کہا۔ "اور میں غیر جانبدار نہیں

ضربِ مومن کے چیف ایمپائر جنرل حمید گل صحافیوں کے درمیان

رہ سکتا۔ میں ایک چھوٹی طاقت کے ساتھ ہوں جسے اس جنگ میں ثابت کرنا ہے کہ چھوٹا ہونے کے معنی کمزور ہونا نہیں ہے۔"

"اچھا، اچھا تم جس کا ساتھ دینا چاہتے ہو ضرور دو مجھے اس سے کوئی غرض نہیں لیکن مجھے یہ تو بتا دو کہ تم میدان جنگ میں جانا چاہو گے یا نہیں۔" میجر صولت رضا نے کہا۔

"ایک اچھے موقع کو میں کبھی کھونا پسند نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ آپ محاذ جنگ پر جا رہے ہیں لہٰذا وہاں آپ کو فوجیوں کے ساتھ خیموں میں رہنا ہو گا۔ گھر کا سا آرام نہیں ملے گا۔ بہت مشقت اٹھانی پڑے گی۔"

"اس کی فکر نہ کیجئے۔" میں نے میجر صاحب کو اطمینان دلا دیا۔

محاذ جنگ کو روانگی

اگلے روز میجر صولت نے ایک فارم پر کرایا جس میں نام اور ولدیت کے علاوہ بینک کا اکاؤنٹ نمبر، وارث کا نام، خون کا گروپ اور اس طرح کی دوسری تفصیلات پوچھی گئی تھیں۔ اس سے شبہ ہوا کہ میدان جنگ میں شہید ہو جانے کے بھی امکانات ہیں۔ احتیاطاً پوچھ ہی لیا۔

"میجر صاحب! خطرے کی کوئی بات تو نہیں۔"

"یہ محض رسمی کارروائی ہے۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

فارم پر دستخط کرنے کے چند روز بعد ایک خط ملا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آپ کو دفاعی نامہ نگار کی حیثیت سے کمیشنڈ آفیسر کا رینک دیا جارہا ہے کہ مزید یہ کہ آپ کو میدان جنگ میں استعمال کے لئے جوتوں اور پتلونوں کی ایک ایک جوڑی، کوٹ، کیپ، کمبل، سلیپنگ بیگ، ناشتے دان، پانی پینے کی بوتل بھی فراہم کی جائے گی۔

اور یوں ۱۲ دسمبر کی صبح کراچی سے دفاعی نامہ نگاروں کا ایک قافلہ محاذ جنگ کے لئے ملتان روانہ ہوا۔ میری خواہش تھی کہ میں بلیو لینڈ کے محاذ کی طرف جاؤں ..... وہ ایک چھوٹا سا ملک تھا جو فاکس لینڈ جیسی بڑی طاقت سے نبرد آزما تھا..... ان دونوں ریاستوں کے درمیان سرحدی باؤنڈری شمال میں دریائے سندھ پر دریائے جہلم اور دریائے چناب کے ساتھ ساتھ ہوتی ہوئی پنجند کے جنوب میں دریائے سندھ سے جاتی تھی۔ میری ہمدردیاں بلیو لینڈ کے ساتھ اس لئے تھیں کیونکہ پاکستان بھی بلیو لینڈ ہی کی طرح ایک ملک تھا جسے بھارت کی شکل میں ایک فاکس لینڈ کا سامنا تھا۔ اس فاکس لینڈ سے پاکستان تین جنگیں لڑ چکا تھا اور ایک آخری فیصلہ کن جنگ تو ابھی باقی تھی۔ بھارت ایشیا کا تھانیدار اور چوہدری بننا چاہتا ہے اور پاکستان اس سے برابری کی بنیاد پر معاملہ کرنے کا خواہش مند ہے بھارت اپنی جنگی طاقت کو بڑھانے کے جنون میں مبتلا ہے۔ پچھلے برسوں اس نے راجستھان کے علاقے میں "براس ٹیک" کے عنوان سے جنگی مشقیں کیں۔ پاکستان اپنے سے پانچ گنا بڑی طاقت بھارت کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ سائز میں چھوٹا سا ملک ضرور ہے لیکن کمزور نہیں۔ پاکستان ان مسلمانوں کا ملک ہے جو تعداد میں ہمیشہ سے کم ہونے کے باوجود جنہوں نے برصغیر پر آٹھ سو سال تک حکومت کی ہے۔ بھارت یہ بات خوب اچھی طرح سے جانتا ہے اسی لئے جب بھی پاکستان کو کہیں سے فوجی امداد ملتی ہے۔ یہ واویلا کر کے آسمان سر پر اٹھا لیتا ہے۔ پاکستان بھوٹان اور سری لنکا جیسا ملک نہیں ہے لہٰذا اس کی طرف آنکھیں ٹیڑھی کر کے دیکھنا فضول ہے۔ اس کا احساس دلانے کے لئے پاکستان کی مسلح افواج نے اپنی جنگی مشقوں کا نام "ضرب مومن" رکھا تھا اور اس میں آٹھ ڈویژن فوج حصہ لے رہی تھی۔ اور یہ پاکستان کی تاریخ کی سب سے بڑی جنگی مشق تھی۔ پہلی فوجی مشق ۱۹۵۰ء کے زمانے میں ہوئی تھی جس میں صرف دو ڈویژن فوج نے حصہ لیا تھا اور اس مشق کا نام "بلیو لینرارڈ" رکھا گیا تھا۔ دوسری مشق ۱۹۶۲ء میں "تیز گام" کے نام سے ہوئی اور تیسری مشق اس کے چند سال بعد "کرسٹل بال" کے عنوان سے ہوئی۔ "ضرب مومن" چوتھی جنگی مشق تھی۔

فاکس لینڈ کے جی او سی میجر جنرل مختار حسین شاہ آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی طاہر مسعود کو سوینئیر پیش کر رہے ہیں

دفاعی نامہ نگاروں کی ٹیم ملتان پہنچی تو رات فوجی چھاؤنی میں قیام کا فیصلہ ہوا۔ ساتھ ہی ٹیم کو دو گروپوں میں تقسیم کرنے کا فیصلہ بھی ہوا۔ ڈائننگ ہال میں میجر شیرازی نے ملتان میں ہمارا خیر مقدم کرتے ہوئے اطلاع دی کہ ایک گروپ ان کی قیادت میں ڈنر کے بعد شور کوٹ روانہ ہو جائے گا جہاں بلیو لینڈ کی فوجیں بے جگری سے لڑ رہی ہیں۔ دوسرا گروپ اگلی صبح بھکر جائے گا کہ اس طرف فاکس لینڈ کی جارح افواج ہیں۔ میرا نام فاکس لینڈ کی طرف جانے والوں میں شامل تھا۔ میں نے اپنے گروپ کے قائد کیپٹن حبیب سے احتجاج کیا کہ مجھے بلیو لینڈ بھیجا جائے کیونکہ میں بلیو لینڈ کا حامی ہوں۔ کیپٹن حبیب نے بڑا روکھا سا جواب دیا۔ بولے۔ "اب آپ کمیشنڈ آفیسر ہیں اور آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ فوج میں ڈسپلن کی بڑی سختی کی جاتی ہے اگر آپ نے زیادہ احتجاج کیا تو کورٹ مارشل بھی ہو سکتا ہے۔

یہ سن کر میں چپ ہو رہا لیکن بلیو لینڈ نہ بھیجے جانے کا افسوس دل میں باقی رہا۔

رات ہم وہیں چھاؤنی کے ایک ہال نما کمرے میں سوئے جہاں پلنگوں پر سفید بے داغ بستر بچھے تھے۔

صحافی فوجی وردی میں

اگلی صبح ہم سب نے فوجی وردیاں پہنیں، سروں پر فوجی کیپ جمائی، کمر میں پیٹیاں باندھیں ہلکے فوجی جوتے پہنے ..... غرضیکہ ہم لوگوں کی شخصیتیں ہی بدل گئیں۔ وردی کا اثر طبیعت پر کتنا گہرا ہوتا ہے اس کا اندازہ اس روز پہلی بار ہوا۔ گہرے سبز رنگ کی فوجی وین میں بھکر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں اسکولوں کی طرف جاتے ہوئے ننھے منے بچے جب ہمیں دیکھتے تو فوجی افسر جان کر کھٹ سے سیلوٹ مارتے۔ ایسا لگتا تھا کہ فوجی افسران بچوں کے آئیڈیل ہوتے ہیں اور بڑے ہو کر فوجی بنان ان کی زندگی کے حسین خوابوں میں سے ایک خواب ہے۔ بھکر پہنچتے پہنچتے سہ پہر ہو گئی۔ کئی گھنٹے کے مسلسل سفر کی وجہ سے ہم لوگ تھک گئے تھے۔ اب ہماری وین درختوں سے گھرے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئی تھی جہاں جابجا مسلح فوجی پہرے دے رہے تھے۔ ہماری پہلی منزل فاکس لینڈ کا ڈویژنل ہیڈ کوارٹر تھا۔ گھنی مونچھوں والے اسمارٹ سے میجر طارق نے ہمارا استقبال کیا۔ پہلے ہمیں میس میں لے جایا گیا۔ یہ میس نصف زمین دوز تھا جس کے چاروں طرف خیمے لگے ہوئے تھے۔ باہر کینو کا ایک شاندار باغ تھا۔ چھوٹے چھوٹے درخت کینوؤں سے لدے پھندے تھے۔ چائے کے گرما گرم کپ نے ہمیں تازہ دم کر دیا۔ پھر ہماری ملاقات فاکس لینڈ کے جنرل آفیسر کمانڈنگ میجر جنرل مختار حسین شاہ سے کرائی گئی۔ جنرل شاہ نہایت خلیق، ملنسار اور منکسرالمزاج انسان ہیں۔ انہوں نے نہایت محبت اور شفقت سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ انہوں نے دیوار پر آویزاں نقشے کی مدد سے جنگ کی تازہ ترین صورتحال سمجھائی۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ ہم فاکس لینڈ کی جانب سے لڑ رہے ہیں اس لئے ہمیں لوگوں کی ہمدردیاں حاصل نہیں ہیں۔ کل میری بچی نے فون پر مجھ سے کہا کہ ابو! آپ نے بلیولینڈ پر حملہ کیوں کیا ہے؟ کچھ سوالات جو ہم لوگوں کے ذہنوں میں تھے، وہ بھی ہم نے ان سے کئے۔ جنرل شاہ کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ "ہم اس جنگ کو اصلی جنگ تصور کر کے لڑ رہے ہیں اور اس میں ہمارے لڑنے کی تکنیک یہ ہے کہ ہمارا سارا زور دفاعی آپریشنز کی تیاری پر ہے۔ انہوں نے تسلیم کیا کہ اگر اصلی جنگ ہوتی تو ہم دشمن کو شکست دینے کے لئے دوسرے بہت سے طریقے بھی استعمال کر سکتے تھے مثلاً اپنے جاسوس دشمن کے علاقے میں بھیجتے۔ لیکن اس وقت ہماری ساری توجہ جنگی منصوبہ بندی کی طرف ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ دشمن کو شکست ہوگی۔ جب گفتگو چل نکلی تو جنرل شاہ نے نہایت اعتماد سے کہا کہ پاکستان آج اس پوزیشن میں ہے کہ آئندہ جنگ دشمن کی سرحدوں میں لڑی جائے۔ اس موقع پر میجر طارق نے بھی دفاعی نامہ نگاروں کو بتایا کہ بلیولینڈ کی فوجیں کہاں تک پہنچ چکی ہیں اور ان کا

میجر قزلباش بلیو لینڈ پر حملے سے پہلے اپنے ماتحت افسروں کو ہدایات دیتے ہوئے

مقابلہ کرنے کے لئے فاکس لینڈ نے کیا کیا منصوبہ بندیاں کی ہیں۔

میجر جنرل مختار حسین شاہ سے بات چیت کے بعد ہم لوگ کافی دیر میس میں بیٹھے فوجی افسروں سے تبادلہ خیال کرتے رہے۔ اس گفت و شنید سے ہمیں یہ احساس ہوا کہ ہماری فوج میں تعلیم و تربیت کا معیار بہت بلند ہے۔ پاکستان کے فوجی افسر نہ صرف پیشہ ورانہ مہارت رکھتے ہیں بلکہ مختلف قومی امور پر ان کی سوچ نہایت روشن، واضح اور جذبہ حب الوطنی سے معمور ہے۔ باہر رات کی تاریکی نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ چونکہ علاقہ حالت جنگ میں تھا اس لئے بلیک آؤٹ کا منظر تھا۔ اونچے اونچے درخت اندھیرے میں آسیب زدہ لگ رہے تھے۔ ہماری وین کا رخ اب ۳۳ فاکس لینڈ بریگیڈ کی طرف تھا۔ تھوڑی دیر میں چاند نکل آیا ہماری وین کولتار کی پتلی سی سڑک پر چلی جارہی تھی اس کے دونوں طرف تھل کا ریتیلا صحرا پھیلا ہوا تھا۔ صحرا میں چاندنی اپنا عجب بہار دکھا رہی تھی۔ وین اب سڑک سے ریتیلی زمین پر اتر گئی اور دس پندرہ منٹ بعد ایک خیمے کے سامنے جا رکی۔

صحرائے تھل میں رات

یہ فاکس لینڈ کا ۳۳ بریگیڈ تھا۔ بریگیڈیر امجد شعیب نے خوش دلی سے ہمیں خوش آمدید کہا۔ وہ طبعاً کم گو محسوس ہوئے لیکن انہوں نے نہایت معلومات افزا گفتگو کی۔ سب سے

پہلے توانہوں نے بتایا کہ ان کا بریگیڈ ۲۵ فاکس لینڈ کا ریزرو بریگیڈ ہے اور آج ہی جنگ کی تازہ صورتحال کے پیش نظر اسی بریگیڈ کو ٹینکوں کے ساتھ اگلے مورچوں کی طرف روانہ کر دیا گیا ہے باقی جو افسران رہ گئے ہیں وہ سامان کے ساتھ کل صبح چلے جائیں گے۔ بریگیڈیر امجد شعیب بے حد مطمئن تھے ان کا کہنا تھا کہ صورتحال ہمارے قابو میں ہے۔ ویسے بھی ایک کمانڈر ہمیشہ دشمن کی تیاریوں پر نظر رکھتا ہے۔

جنگ بھی شطرنج کی طرح کا ایک کھیل ہے۔ فرق یہ ہے کہ اس میں ہمارے ذرائع رے ڈار انٹیلی جنس، طیارے وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور اب تو پاکستان نے ایسے طیارے تیار کر لئے ہیں جن میں پائلٹ نہیں ہوگا اور جو دشمن کے تیس کلو میٹر کے علاقے تک جاکر اطلاعات لاسکیں گے۔ بریگیڈیئر صاحب سے پوچھا گیا کہ اس جنگ میں جو ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں وہ کس ملک کے تیار کردہ ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ ٹینکوں میں ہمارے پاس امریکی ٹینک ایم ۴۸ ہیں جو کچھ عرصہ پہلے خریدے گئے تھے۔ امریکہ نے کوریا میں ان ٹینکوں کو استعمال کیا تھا اور اب اس نے انہیں مزید جدید بنا کر زیر استعمال رکھا ہوا ہے۔ جدید بنانے کے بعد ان ٹینکوں میں سوا ایم کی گنوں کا اضافہ ہو گیا ہے۔ یہ علاقہ ٹینکوں کی لڑائی کے لئے بہترین ہے۔ اس وقت ہمارے پاس جو ٹینک ہیں ان میں رات کو دیکھنے والی دوربینیں نصب ہیں اور ہمارے پاس ایک ایسا سسٹم بھی ہے کہ ہماری توپیں رات کے اندھیرے میں میدان جنگ کو روشن کر سکتی ہیں۔ جب روشنی کے گولے آسمان کی طرف پھینکے جاتے ہیں تو میدان جنگ روشن ہو جاتا ہے۔ یہ روشنی تیس چالیس سیکنڈ تک رہتی ہے جس سے اندھیرے میں چھپے ہوئے دشمن کا پتہ چلایا جاسکتا ہے تاکہ اس پر حملہ کیا جاسکے۔ انہوں نے یہ معلومات بھی دی کہ پاک فوج کے پاس پانی میں تیرنے والی بکتر بند گاڑیاں بھی ہیں۔ آبدوز کی طرح ان کی ایک پائپ پانی کی سطح کے اوپر رہتی ہے جو فضا کا جائزہ لیتی رہتی ہے اس میں سمت معلوم کرنے کا بھی آلہ نصب ہوتا ہے۔

بریگیڈیئر امجد شعیب سے سوال کیا گیا کہ اگر بلیو لینڈ کئی ڈویژن فوج کے ساتھ فاکس لینڈ پر حملہ کرتا ہے تو آپ کتنے روز تک بلیو لینڈ کا مقابلہ کر سکیں گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ دفاع کرنے اور حملہ کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب آپ دفاع کرتے ہیں تو آپ کی حکمت عملی یہ ہوتی ہے کہ آپ دشمن کے حملے کا توڑ کرنے کی فکر کرتے ہیں۔ آپ کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ حملہ آور کتنی نفری لیکر آیا ہے۔ کیا وہ دریا پار کر کے تو نہیں آیا۔ جس علاقے میں دشمن آیا ہے وہ اس سے واقف نہیں ہوتا دوسری طرف آپ چونکہ اپنے علاقے میں ہوتے ہیں اس لئے اس سے خوب اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ دشمن نے دفاعی مورچے تیار نہیں کیے ہوتے بلکہ وہ کھلی زمین پر بیٹھا ہوتا ہے۔ گویا دشمن کے مقابلے

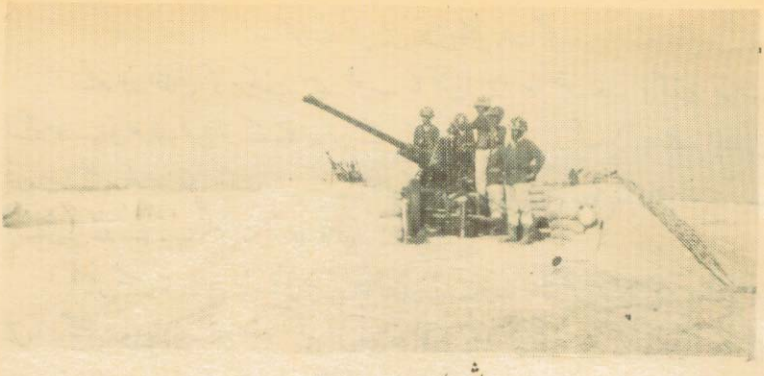

دشمن کے طیاروں کا انتظار !

میں آپ کو بہت سی سہولتیں حاصل ہوتی ہیں۔ ایسی صورت میں آپ کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ دشمن جتنے وسائل کے ساتھ آیا ہے وہ سب کو استعمال نہ کر سکے۔ آپ تھوڑی سی نفری سے دشمن پر اسی طرح حملہ کرتے ہیں کہ اس میں افراتفری پھیل جائے اور ایسا کرنا بے حد آسان ہوتا ہے کیونکہ دشمن اپنے مسائل میں اس طرح گھرا ہوتا ہے کہ وہ جم کر نہیں لڑ سکتا۔

بریگیڈیئر امجد شعیب دھیمے دھیمے سنجیدہ لہجے میں باتیں کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ عوام ان جنگی مشقوں میں فوج کے ساتھ بھرپور تعاون کر رہے ہیں۔ لوگوں نے فوج کو بہت عرصے کے بعد دیکھا ہے اس لئے وہ بہت خلوص و محبت سے پیش آرہے ہیں۔ فوج نے ان مشقوں کے سلسلے میں سینکڑوں میل لمبے راستے بنائے ہیں جس سے یہاں کے لوگوں کو بڑا فائدہ پہنچا ہے۔ ان جنگی مشقوں میں فصلوں کھیتوں اور زمینوں کو نقصان پہنچنے کا بھی اندیشہ ہے اس مقصد کے لئے فوج، نے چھ کروڑ روپیہ الگ مختص کیا ہے تاکہ جن لوگوں کی فصلوں کو نقصان پہنچے انہیں اس کا معاوضہ دیا جاسکے۔ نقصان کا اندازہ لگانے کیلئے ہر بریگیڈ اور یونٹ میں ایک کمپنسیشن آفیسر مقرر کیا گیا ہے۔ ان علاقوں میں پینے کے پانی کی بڑی قلت ہے۔ زمین کے اندر نمکین پانی ہے جسے ڈاکٹر کیمیائی تجزیئے کے بعد بتاتے ہیں کہ انہیں پیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ گفتگو کے بعد میز پر کھانا چن دیا گیا۔ ہم لوگ فوراً ہی کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

کیپٹن حبیب نے کھانے کے بعد اعلان کیا کہ ہمارے چار ساتھی رات یہی قیام کریں گے۔ بقیہ افراد چوبارہ جائیں گے۔ میرے علاوہ اخبار جہاں کے اخلاق احمد، تکبیر کے ناصر محمود اور جسارت کے خانزادہ شامل تھے۔

یہ صحرائے تھل میں ہماری پہلی رات تھی۔

مجھے اور اخلاق کو بریگیڈیئر امجد شعیب کا تقریباً اجڑا ہوا خیمہ ملا۔ بریگیڈیئر صاحب اگلے مورچے کی طرف کوچ کر گئے تھے اور ان کے بچے کچھے خیمے میں دو پلنگ پڑے تھے۔ ایک ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ ایک جوان نے ٹیلی فون کا استعمال یہ بتایا کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو اس آلے کی مدد سے آپ میس میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

ہمیں میس میں رابطہ کرنے کی ضرورت تو پیش نہیں آئی۔ البتہ تھل کے وسیع و عریض صحرا میں جسے چھٹکی ہوئی چاندنی نے پراسرار حسن بخش دیا تھا، ہماری نیند اڑ گئی تھی۔ ہم صبح تین بجے تک دنیا و جہان کے معلومات پر باتیں کرتے رہے۔ صبح سویرے ایک جوان نے ہمیں نیند سے بیدار کیا اور اطلاع دی کہ یونٹ کوچ کر رہا ہے ہم نے دیکھا کہ واقعی فوجی جوان اپنے اپنے خیمے لپیٹ رہے ہیں سورج طلوع ہو چکا تھا اور سردی کی شدت کم ہو چکی تھی۔

"آؤ دوست تصویریں بناتے ہیں" اخلاق نے کہا۔ ابھی ہم تصویر کشی میں مصروف تھے کہ دور سے ایک باوقار فوجی افسر کو اپنی جانب آتے دیکھا۔

"کیپٹن حسن رائے" فوجی افسر نے اپنا تعارف کرایا۔ "ہمیں بہت افسوس ہے کہ ہم آپ کے لئے کوئی بہت اچھا انتظام نہیں کر سکے۔"

"نہیں ہمیں تو بہت اچھی نیند آئی اور پھر اسی ویرانے میں اس سے اچھا انتظام اور ہو بھی کیا سکتا ہے۔"

"ہم لوگ تو اس زندگی کے عادی ہیں آپ کیلئے یقیناً یہ نیا تجربہ ہو گا"

کیپٹن رائے نے مسکرا کر کہا۔

"جی ہاں نیا اور دلچسپ تجربہ" میں نے جواب دیا "لیکن کیپٹن صاحب یہ خیمے کے چاروں طرف ایک ایک فٹ زمین کیوں کھدی ہوئی ہے۔"

"بات یہ ہے کہ اس علاقے میں صحرائی سانپ اور بچھو بہت کثرت سے ہوتے ہیں۔ متعدد واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ جب ہمارے جوان صبح سو کر اٹھے ہیں اور انہوں نے جوتے پہننے کیلئے پیر ڈالا ہے تو جوتے میں چھپے ہوئے سانپ نے ڈس لیا ہے اور فوراً ہی موت واقع ہو گئی ہے۔ ان سانپوں اور بچھوؤں سے بچنے کیلئے یہ زمین کھود دی گئی ہے تاکہ وہ خیمے کے اندر داخل نہ ہو سکیں۔"

کیپٹن رائے نے اطمینان سے ساری تفصیل بیان کی۔ میں نے اور اخلاق نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ہم دونوں نے محسوس کیا کہ ایک لمحے کیلئے ہمارے چہروں سے مسکراہٹ غائب ہو گئی ہے۔

میدان جنگ میں کینو کھانا جرم ہے،

مسئلہ یہ آ پڑا تھا کہ ہم چاروں اپنے رات کے بچھڑے ہوئے ساتھیوں تک کس طرح پہنچیں ۔ اس یونٹ کے پاس کوئی فاضل گاڑی ایسی نہیں تھی جو ہمیں لے کر چوبارہ جاسکے جہاں ہمارے ساتھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ دھوپ کے سامنے بچھی ہوئی کرسیوں پر ہم بیٹھے تھے کہ ایک چمکتی بڑی فوجی گاڑی آکر رکی۔ کیپٹن رائے، لیفٹننٹ توفیق اور لیفٹننٹ طاہر نے اٹھ کر سیلوٹ کیا۔ ہم چاروں فوجی لباس میں ہونے کے باوجود بیٹھے ہی رہے۔ گاڑی سے اترنے والی فوجی شخصیت نے ہم پر قہر آلود نگاہ ڈالی۔ "آپ یقیناً" سوچ رہے ہوں گے کہ ہم نے آپ کو سیلوٹ کیوں نہیں کیا تو بات یہ ہے کہ ہم لوگ دفاعی نامہ نگار ہیں۔ " "اخلاق نے آگے بڑھ کر وضاحت کی۔ "اچھا اچھا بہت خوب، خوشی ہوئی مل کر " آنے والی شخصیت کے تاثرات بدلے یہ کرنل انور تھے۔ ضرب مومن کے ایپائر۔ تب ہمیں معلوم ہوا کہ فاکر لینڈ اور بلیولینڈ کی اس جنگ میں ہار جیت کا فیصلہ کرنے کے لیے باقاعدہ ایپائر مقرر کیے گئے ہیں۔ دونوں افواج کو ایپائر دیئے گئے ہیں جو ان کی کارکردگی کا پورا ریکارڈ رکھ رہے ہیں۔ ان ایپائروں کے بھی ایک سربراہ ہیں جو چیف ایپائر کہلاتے ہیں اور ان کا نام ہے جنرل حمید گل..... پاک فوج کی مشہور و معروف ایجنسی آئی ایس آئی کے سابق سربراہ ۔ کرنل انور سے ان کے فرائض کے بارے میں گفتگو چھڑ گئی۔ انہوں نے اس جنگ کے قواعد و ضوابط کی بابت دلچسپ معلومات فراہم کیں۔ ہمارے ذہنوں میں چند سوالات تھے مثلاً یہ کہ فاکس لینڈ اور بلیو لینڈ کی یہ جنگ اصل جنگ سے کتنی قریب ہے مثلاً طیارے بمباری کرتے ہیں؟ توپ خانے گولہ باری کرتے ہیں ؟ فائرنگ ہوتی ہے تو کیا فوجی ہلاک بھی ہوتے ہیں؟ آخر یہ جنگ ہو کیسے رہی ہے؟ معلوم ہوا کہ یہ ساری جنگ ایک قسم کی وار گیم ہے۔ اس میں نصف لڑائی حقیقی اور نصف، کاغذی اور تصوراتی ہے۔ محض منصوبہ بندی اور اصول و ضوابط کی پابندی کی روشنی میں یہ جنگ لڑی جارہی ہے۔ مثلاً فاکس لینڈ کے طیاروں کو بلیولینڈ کے جن ٹھکانوں پر حملہ کرنا ہوتا تھا اس کی اطلاع پہلے سے ایپائروں کو دے دی جاتی تھی اور طیارے بلیو لینڈ کے ٹھکانوں پر سے پرواز کرتے ہوئے گزر جاتے تھے اور ان ٹھکانوں کو تباہ شدہ تصور کر لیا جاتا تھا۔ بلیولینڈ کے رے ڈار پر حملہ آور طیاروں کو دیکھ لیا جاتا اور وہ طیارہ شکن توپوں کی زد میں آجاتے تو ان طیاروں کو تباہ قرار دے دیا جاتا ۔ جہاں بارودی تار بچھانے ہوتے وہاں سفید پٹیاں دور تک باندھ دی جاتی تھیں۔ ایپائروں کی پہچان یہ تھی کہ ان کے بازوؤں پر سفید پٹیاں بندھی ہوتی تھیں اور ان کی گاڑیوں پر سفید پرچم لہرا رہے ہوتے تھے۔

جس وقت کرنل انور سے ہماری گفتگو ہو رہی تھی ہمارے سامنے بچھی ہوئی میز پر لیفٹننٹ طاہر

نے کینوؤں کے ڈھیر لگا دیئے میں نے پوچھا۔ "کرنل صاحب جنگی قواعد کی خلاف ورزی کی کیا صورتیں ہیں؟ کرنل انور نے نہایت طنزیہ لہجے میں میز پر پڑے کینوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "جنگ کے ماحول میں اس سے شغل کرنا بھی خلاف ورزی کی ایک شکل ہے۔ "بات ٹھیک بھی تھی۔ اگر واقعتاً جنگ ہو رہی ہوئی تو اتنے مزے سے ہم کب پھلوں سے لطف اندوز ہو سکتے تھے۔ ناصر اور خانزادہ تھوڑی دیر بعد کرنل انور کے ساتھ ہی اگلے محاذ کی جانب روانہ ہوگئے۔ جبکہ میں اور اخلاق ایک کھلی جیپ میں لیفٹننٹ طاہر کے ہمراہ چلے۔ جیپ کے پیچھے ایک ٹرالر بھی بندھا ہوا تھا جس میں ہم لوگوں کا سامان رکھا تھا۔ لیفٹننٹ طاہر دوران سفر خاموش رہا۔ بعد میں جب وہ ۳۳ بریگیڈ میں کرسی پر خاموشی سے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا تو میں نے اس سے گفتگو کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم نے آرمی کیوں جوائن کی؟ "میری ماں کی خواہش تھی" ۔ اس نے جواب دیا: "میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں۔ میری ماں چاہتی تھی کہ میں فوج میں جاؤں اور وطن کی حفاظت کروں" ۔

"جب تم پہلی بار وردی پہن کر ماں کے سامنے گئے ہوگے تو وہ کتنی خوش ہوئی ہوں گی" میں نے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے کہ میں کبھی وردی پہن کر گھر نہیں گیا" ۔ لیفٹننٹ طاہر نے کہا۔

انگورہ کے ۳۳ بریگیڈ میں ایک نہ بھلانے والی شخصیت میجر سرتاج مرزا قزلباش کی تھی۔ پرنسپل اسٹاف آفیسر ہونے کی وجہ سے ان پر بہت ذمہ داریاں تھیں۔ لیکن انہوں نے ہمیں بہت وقت دیا۔ سارا دن ان سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ وقفے وقفے سے اپنے آپریشن روم میں چلے جاتے اور جونہی ذرا سی فرصت میسر آتی ہمارے پاس چلے آتے۔ وہیں ہم نے دوپہر کا لنچ کیا۔ میجر قزلباش کے کالج کے زمانے میں تین گہرے دوست تھے۔ ان تینوں نے ایک دن فیصلہ کیا کہ انہیں فوج میں جانا چاہئے۔ ایک دوست کا سلیکشن ایئر فورس میں ہوگیا بقیہ دو کا بری فوج میں۔ میجر قزلباش نے کہا "جنگ کوئی اچھی چیز نہیں ہے لیکن کوئی بھی قوم اس وقت تک صحیح معنوں میں آزاد نہیں کہلا سکتی جب تک اس کا دفاع مضبوط نہ ہو" ۔

تھل کے صحرا میں یہ ہمارا پہلا دن تھا۔ ہمارے دل میں بے پناہ شوق تھا کہ کسی سچ مچ کی لڑائی کا منظر دیکھیں۔ جب ہم نے اس خواہش کا اظہار میجر قزلباش سے کیا تو وہ فوراً آمادہ ہوگئے۔ انہوں نے کہا "آپ کی خوش قسمتی سے ہم آج رات اپنے کچھ علاقوں کو چھڑانے کے لئے بلیو لینڈ پر حملہ کریں گے۔ آپ اس میں شریک ہونا چاہتے ہیں تو پھر آپ کو رات تک انتظار کرنا ہوگا" ۔

اب ہمیں رات کا انتظار تھا۔ (باقی آئندہ)

آنکھ مچولی دعوتِ تحریر

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

زبانیں اظہار کا وسیلہ ہیں ـــــ زبانیں پیغام کے تبادلے کا ذریعہ ہیں
ہماری سرزمین پر بولی جانے والی سب زبانیں ـــــ میٹھی سُندر اور پیاری ہیں
آیئے اپنی دھرتی کی سب زبانوں سے پیار کا اظہار کریں

ماہنامہ آنکھ مچولی پاکستان کے چاروں صوبوں کی زبانوں میں ایک ہی موضوع پر مضمون لکھنے کی دعوت دے رہا ہے
سندھی ، بلوچی ، پنجابی اور پشتو میں سے آپ جس زبان میں بھی چاہیں
ایک مختصر سا مضمون لکھئے ...

موضوع ہے ... " قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں

قابلِ اشاعت مضامین کو تحائف بھجوائے جائیں گے

- ۳۱ مارچ ۱۹۹۰ء مضمون بھجوانے کی آخری تاریخ ہے ۔
- تحریر صاف ، خوش خط اور کاغذ کے ایک جانب لکھیں ۔
- جس صفحے پر مضمون لکھیں اُس کی پُشت پر اپنا نام اور پتا ضرور لکھیں ۔
- مضمون دو فُل اسکیپ صفحے سے زیادہ طویل نہیں ہونا چاہیئے ۔

آنکھ مچولی " دعوتِ تحریر " ڈی ، ۱۱۲ ، سائیٹ کراچی نمبر ۱۶

پانی

زندگی کا سرچشمہ

نیّر ابدالی

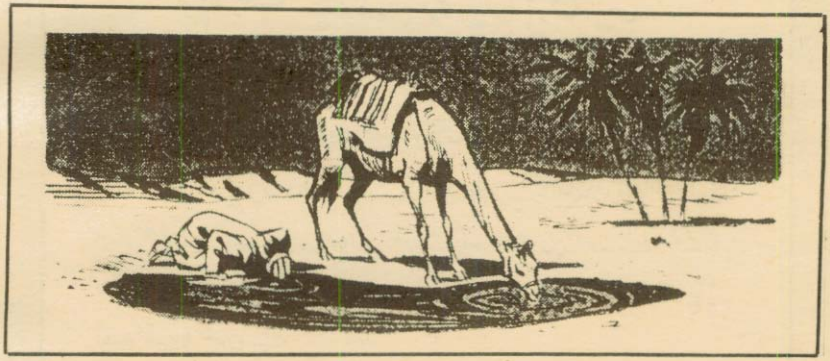

پانی پیتے ہوئے یا کبھی ہاتھ منہ دھوتے ہوئے ہم نے کبھی بھی اس کی اہمیت پر غور نہیں کیا ہوگا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پانی انسانی زندگی کے لئے نہایت اہم ہے۔ یعنی انسانی جسم کی نشوونما کے لئے کاربوہائیڈریٹ پروٹین، وٹامن، معدنیات اور چکنائی ضروری ہیں، پانی ان سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ یقین نہ کریں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انسان کو اگر چالیس روز تک خوراک نہ ملے تب بھی وہ زندہ رہ سکتا ہے مگر پانی کے بغیر وہ سات دن کے بعد موت کے منہ میں چلا جائے گا۔

پانی ہمارے جسم میں غذا کو تحلیل کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی طرح جسم کے فالتو مادوں کا اخراج بھی پانی ہی کے ذریعے عمل میں آتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پانی انسانی جسم کے لئے سب سے زیادہ ضروری ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک عام آدمی کے جسم میں اس کے کُل وزن کا ۶۵ سے ۵، فیصد حصّہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی طرح جسم کے ۰، سے ۵، فیصد ٹشوز بھی پانی سے بنے ہوتے ہیں۔ ہمارا خون بھی پانی کی وجہ سے پتلا ہوتا ہے۔ اور سارے جسم میں دوڑا پھرتا ہے۔ خدانخواستہ یہی خون پانی کی کمی سے اگر گاڑھا ہو جائے تو صرف چند منٹوں میں انسان کی موت واقع ہو سکتی ہے۔

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ ہماری ہڈیاں جو بظاہر ٹھوس معلوم ہوتی ہیں۔ ان کا ۲۰ فیصد سے زائد پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایک عام آدمی پورے دن میں تین کوارٹ QUART پانی استعمال کرتا ہے۔ واضح رہے کہ ایک کوارٹ چوتھائی گیلن کے برابر ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک عام آدمی پون گیلن پانی ایک روز میں استعمال کر لیتا ہے۔

یوں تو پانی کو چائے، کافی، لسی یا شربت کی شکل میں بھی استعمال کیا جاتا ہے مگر سادہ پانی کے ایک گلاس کی اہمیت اپنی جگہ ہمیشہ برقرار رہے گی۔ اسی طرح ہماری خوراک کا پچاس فیصد حصہ بھی پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہمارے جسم سے پانی مختلف ذریعوں سے نکلتا بھی رہتا ہے۔ گُردے کے ذریعے پیشاب کی شکل میں، جلد سے پسینے کی شکل میں اور بخارات کے ذریعے جسم کا پانی خارج ہوتا ہے۔ بسا اوقات جسم کا پانی بڑی مقدار میں خارج ہو جاتا ہے جو زندگی کے لئے خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ جسم میں پانی کی شدید کمی کو DEHYDRATION کہا جاتا ہے۔ ڈی ہائیڈریشن کے عمل میں خون نہایت گاڑھا ہو جاتا ہے اور دل تک نہیں پہنچ پاتا۔ چنانچہ جب دل خون کو پمپ کرنے سے قاصر ہو جائے تو وہ رُک جاتا ہے جسے ہارٹ فیل ہونا کہتے ہیں۔ ہم میں سے اکثر ساتھی پانی بہت کم پیتے ہیں۔ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن کے ڈاکٹر ہیرالڈ لوبن کا کہنا ہے کہ "ہر شخص کو ایک دن میں کم از کم آٹھ گلاس پانی ضرور پینا چاہیئے۔"

ڈائیٹنگ کرنے والے افراد کے لئے ڈاکٹروں کی خاص ہدایت ہے کہ وہ ڈائیٹنگ کے دوران اپنی صحت کا خاص خیال رکھیں اور خاص طور پر جسم میں پانی کی کمی کا نوٹس لیں۔ اسی طرح ایک ماہر کھیل مسٹر رابرٹ یاسس تمام ایتھلیٹ کو یہی مشورہ دیتے ہیں کہ وہ کھیل سے قبل، کھیل کے دوران اور کھیل کے بعد پانی ضرور پیا کریں۔ تاکہ جسم سے پسینے کی شکل میں جو پانی نکلتا رہا ہے اس کی کمی پوری ہو سکے۔ ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ پانی پینے سے قوت میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہماری جلد کی خوبصورتی کا دارومدار بھی ہمارے جسم میں موجود پانی پر ہوتا ہے۔ پانی کی کمی ہونے کی صورت میں جلد سکڑ جاتی ہے اور اس پر جھُرّیاں پڑنے لگتی ہیں۔

نیویارک یونیورسٹی اسکول آف میڈیسن کے پروفیسر ڈاکٹر نکولس سوٹر کا کہنا ہے کہ "اپنی جلد کا خیال رکھیئے۔ خصوصاً چہرے کی جلد کا۔ اسے دھوتے وقت خاصی احتیاط برتیئے۔ کیونکہ اس میں موجود چکنائی کے گلینڈز آپ کے چہرے کو خشک ہونے سے محفوظ رکھتے ہیں۔"

پانی سے مختلف امراض کی روک تھام کا طریقہ قدیم زمانے سے موجود ہے۔ جاپان میں ۱۵۰۰ سال پہلے گرم پانی کے ٹب بنے ہوتے تھے۔ جہاں بیماروں اور عام آدمیوں کے لئے نہانے کی کھُلی آزادی تھی۔

اسی طرح رومنوں کے ہاں بھی معدنی چشموں پر نہانے کا رواج عام تھا۔ ان معدنی چشموں کے پانی سے مختلف امراض خصوصاً جلدی امراض میں نہایت فائدہ ہوتا ہے۔ کیونکہ پانی میں شامل مختلف معدنیات اور خود پانی کا نیم گرم ہونا بھی جلد کو جراثیم سے محفوظ رکھتا ہے۔

اسی طرح ٹھنڈے پانی کو بھی طبی لحاظ سے ڈاکٹر حضرات مفید قرار دیتے ہیں۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ کسی کو تیز بخار چڑھ جائے تو ڈاکٹر کے کہنے پر اس کی پیشانی پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھی جاتی ہیں۔ اسی طرح سوجن کو بھی ٹھنڈے پانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔ اگر پٹھوں میں کھنچاؤ کی کیفیت پیدا ہو اور درد محسوس ہو تو پھر گرم پانی سے اس کو سینکنے میں بڑا آرام ملتا ہے۔

گویا کھانے پینے سے لے کر نہانے اور سینکائی کرنے کے علاوہ بھی پانی کا ایک اور فائدہ ہے۔ اگر کہیں آگ لگ جائے تب بھی یہی پانی اُسے بجھانے کے کام آتا ہے۔ گویا جسم کی حفاظت سے لے کر آگ سے بچاؤ تک یہ ہر موقعہ پر ہمارے کام آتا ہے۔ آخر میں ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ پانی کن چیزوں سے مل کر بنتا ہے۔ پانی ہائیڈروجن اور آکسیجن سے مل کر بنتا ہے" ہائیڈروجن کے دو سالمے اور آکسیجن کا ایک سالمہ" یعنی "H_2O" یہ ہے پانی کا فارمولا۔ سچی بات یہ ہے کہ پانی کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہمیں پیاس کی حالت میں ہوتا ہے۔ جب زبان پر کانٹے پڑنے لگیں یا حلق سوکھ جائے تب پانی کا ایک گلاس دنیا کی تمام نعمتوں پر بھاری نظر آتا ہے۔

روشنیوں اور ہنگاموں کے شہر کراچی کے پس منظر میں

مشہور ڈرامہ نگار حمید کاشمیری کا نیا ناول

آنکھ مچولی کی ایک شاندار اور فخریہ پیش کش

یہ ایسے بچوں کی کہانی ہے جو منشیات، لسانی فسادات، تخریب کاری اور قتل و غارت گری کے ماحول میں اپنے مستقبل سے بے خبر پرورش پا رہے ہیں۔

قدم قدم پر حیران کن واقعات جن میں تجسس بھی ہے اور مہم جوئی بھی

بہت جلد آنکھ مچولی میں سلسلے وار ملاحظہ کیجئے

سچّی خوشی

حنا خیری

اسد اور جاوید دونوں ہم جماعت بھی تھے اور دوست بھی۔ دونوں کے گھر بھی پاس پاس تھے۔ جاوید کا گھر اسد کے گھر سے دو گلیاں پہلے تھا۔ ان کا اسکول زیادہ دور نہیں تھا۔ دونوں دوست ایک ساتھ اسکول جاتے تھے۔ اسد جاوید کے گھر آجاتا اور پھر دونوں ساتھ ہی نکلتے۔ دونوں کا تعلق درمیانے طبقے سے تھا۔ اسد کا باپ ایک گورنمنٹ کے اسکول میں پڑھاتا تھا جبکہ جاوید کا باپ ایک جگہ ہیڈ کلرک تھا۔ دونوں دوست ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ جب امتحان نزدیک ہوتے تو دونوں اکثر ساتھ مل کر پڑھائی کرتے۔ کبھی اسد جاوید کے یہاں چلا جاتا تو کبھی جاوید اسد کے یہاں آجاتا۔ دونوں دوست گھر سے لنچ بکس لایا کرتے تھے۔ کبھی توس مکھن، کبھی انڈا پراٹھا کبھی پوری بھجیا۔ اور ساتھ مل کر کھاتے۔ ہاں کبھی کبھی پیسے بھی لاتے اور اسکول کی کینٹین سے سموسے، چھولے یا آئس کریم کھاتے۔ مگر ایسا بہت کم ہوتا۔ ان کے ماں باپ روز روز ان کو پیسے نہیں دے سکتے

تھے۔

دونوں دوست پیسے جمع کر رہے تھے تاکہ انعامی بونڈ خرید سکیں۔ جب دونوں کے پاس دس دس روپے جمع ہوگئے تو جاوید اپنے اور اسد کے لئے بونڈ خرید لایا۔ "یہ لو" جاوید نے ایک بونڈ اسد کی طرف بڑھایا "یہ تمہارا ہے" اسد اپنے بونڈ کو غور سے دیکھنے لگا۔ "کاش میرا انعام نکل آئے" اس نے اپنے دل میں کہا۔ "اپنا بونڈ دکھانا ذرا" اس نے جاوید سے کہا۔ جاوید نے اپنا بونڈ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اسد اسے بھی الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ "ارے یار میں اپنی کاپی تو ماسٹر صاحب سے لینا ہی بھول گیا ابھی لے کر آتا ہوں" یہ کہہ کر جاوید تیزی سے کلاس کی طرف بھاگا۔ جب وہ واپس آیا تو اسد نے اس کا بونڈ اسے واپس کرتے ہوئے کہا "اگر انعام نکل آئے تو مزا ہی آجائے۔"

جاوید کے ابّا کی آنکھوں میں تکلیف رہنے لگی تھی۔ ڈاکٹر کو جب دکھایا تو مختلف ٹیسٹ ہوئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ بینائی کو خطرہ ہے آپریشن کرانا پڑے گا۔ آپریشن کے لئے تیس چالیس ہزار کا خرچہ تھا اور ان کے پاس تو کچھ بھی نہ تھا۔ مکان بھی کرایہ کا تھا۔ جاوید سے بڑا ایک بھائی تھا جو نویں میں پڑھتا تھا باقی بہن بھائی اس سے چھوٹے تھے۔ جاوید کے ابا نے اپنے دفتر سے قرض مانگا تو صاف جواب مل گیا۔ جاوید نے یہ ساری باتیں رو رو کر اسد کو بتائیں۔ اسد کو بہت افسوس ہوا۔ دینے کو تو اس نے تسلی دے دی تھی کہ سب ٹھیک ہو جائے گا مگر خود اس کی سمجھ میں بھی نہ آرہا تھا کہ اب کیا ہو گا۔

گھریلو پریشانیاں بڑھ گئی تھیں اس لئے جاوید بہت چڑچڑا اور بد مزاج ہو گیا تھا۔ بات بات پر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ اسد اس کے مزاج کی تبدیلی سے پہلے حیران تو ہوا مگر پھر ساری وجہ اس کی سمجھ میں آگئی۔ جاوید اکثر چھوٹی چھوٹی باتوں پہ اس سے لڑنے لگتا۔ اسد اپنی سی کوشش کرتا کہ کوئی ایسا موقع نہ آئے مگر جب کوئی لڑنے پر تلا ہی بیٹھا ہو تو دوسرا کتنی ہی کوشش کر لے تلخی اور لڑائی جھگڑا ہونے سے روک نہیں سکتا۔ ایک دن ایسا ہی ہوا۔ حسب معمول جاوید کا موڈ خراب تھا۔ اسد نے اسے ہنسانے کے لئے کوئی مزاق کیا تو وہ چراغ پا ہو گیا۔ اور بے نقط اسد کو سنانے لگا۔ اسد ششدر تھا۔ "دیکھو جاوید میرا یہ مطلب نہیں تھا تم غلط سمجھ رہے ہو" اس نے کہنے کی کوشش کی مگر جاوید نے ایک نہ سنی۔ آخر اسد کو بھی غصہ آگیا "ٹھیک ہے نہیں سنتے ہو نا سنو۔ ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے۔ آخر کوئی کب تک تمہاری خوشامد کرے۔ میں جتنی زیادہ تمہارے ساتھ نرمی سے بات کرتا ہوں اتنا ہی زیادہ تمہارا دماغ چڑھ جاتا ہے" "ہاں تو مت کیا کرو بات" جاوید نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا "مجھے نہیں ضرورت کسی کی ہمدردی کی۔"

اور اس طرح پہلی مرتبہ دونوں دوستوں میں لڑائی ہو گئی اور بڑی شدت سے ہو گئی۔ کئی روز اسی طرح گزر گئے۔ دونوں دوست اب الگ الگ اسکول آتے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے۔ کلاس میں بیٹھتے تو ایک دوسرے کو نظر انداز کرنے کی بھرپور کوشش کرتے۔ ان کے مشترکہ دوستوں اور ہم جماعت ساتھیوں نے ان کی دوستی کرانے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ دونوں میں سے کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ اینٹھے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتے۔

اس روز بھی حسب معمول وہ سویرے ہی اٹھ گیا تھا اور اخبار کا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار ایک زور دار آواز کے ساتھ اخبار اس کے قریب آ کے گرا۔ اسد نے جلدی سے اخبار اٹھایا اور کھولا۔ آج انعامی بونڈ کی قرعہ اندازی کے نتائج چھپے تھے۔ اسد کو اپنا نمبر زبانی یاد تھا۔ وہ بے صبری سے اپنا نمبر تلاش کرنے لگا اور پھر اسے اپنا نمبر مل گیا۔ ہاں وہ ایک لاکھ کے انعام کا مالک بن چکا تھا۔ اس نے دوبارہ دیکھا پھر تیسری بار دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پہ یقین نہ آ رہا تھا۔ کیا واقعی اس کا انعام نکل آیا تھا۔ وہ جلدی سے اندر گیا اور اپنا بونڈ نکال لایا۔ بونڈ کا نمبر اخبار میں چھپے نمبر سے ملایا تو اس میں سر مو فرق نہ تھا۔ خوشی کے مارے اسد کی عجیب حالت ہو گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ کیا کرے، اچھلے کودے، خوشی کے مارے چیخنے لگے، کس طرح اتنی بڑی خوشی کو سہارے۔ اب میں ابو سے کہوں گا ایک گاڑی لے لیں، وہ سوچنے لگا، نئی نہیں تو کیا ہوا۔ پرانی خرید لیں۔ پرانی تو اتنے میں آ جائے گی نا۔ اور رنگین ٹیلی ویژن بھی، تصور ہی تصور میں وہ خود کو گاڑی میں بیٹھا ہوا اور رنگین ٹی وی دیکھتا ہوا دیکھنے لگا۔ کتنا مزا آئے گا اب ہمارے پاس گاڑی بھی ہوگی رنگین ٹی وی بھی۔ فرج بھی تو پرانا ہو گیا ہے۔ نیا لے لیں گے۔ اور میں اپنے اچھے اچھے کپڑے بناؤں گا۔ اور گاڑی میں بیٹھ کر بڑی شان سے اسکول جاؤں گا۔ سب لڑکے رشک سے دیکھیں گے اور جاوید بھی..... جاوید کا خیال آتے ہی وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ جاوید کے بونڈ کا نمبر اسے معلوم تھا۔ "شاید جاوید کا انعام بھی نکلا ہو" اس نے اپنے آپ سے کہا "پھر اگر نہیں بھی نکلا تو کیا ہوا۔ میرا تو نکل آیا ہے" پھر اسے نے شکر گزاری سے آسمان کی طرف دیکھا اور بولا "شکر ہے میرے اللہ" پھر اس کے جی میں جانے کیا آئی وہ جاوید کا نمبر تلاش کرنے لگا۔ جاوید کا نمبر اس میں نہیں تھا۔ وہ اخبار بغل میں دبا کر سب کو یہ خوشخبری سنانے اندر جا ہی رہا تھا کہ ایک دم جاوید کا اداس، مایوس اور غمزدہ چہرہ اس کی نظروں کے سامنے آ گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے بیمار باپ کی صورت اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگی۔ پھر جاوید کی روتی اور کانپتی ہوئی آواز اس کے

کانوں میں گردش کرنے لگی "ڈاکٹروں نے کہا ہے اگر ابو کا آپریشن نہیں کرایا گیا تو ان کی بینائی کسی وقت بھی ختم ہو سکتی ہے۔ ابو کے دفتر والوں نے بھی قرض دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ..... " ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ اب کیا ہو گا؟ بتاؤ اسد اب کیا ہو گا" جواب میں اسد نے کہا تھا "اللہ مدد کرنے والا ہے"

"اللہ واقعی مدد کرنے والا ہے" اس کے منہ سے نکلا۔

جاوید اسکول جانے کے لئے تیار ہو چکا تو ایک مانوس سی دستک سن کر چونک اٹھا۔ دروازہ کھولا تو سامنے ہی اسد کھڑا تھا۔ اسد کو یوں اپنے دروازے پہ پاکر جاوید حیرت زدہ سا کھڑا تھا کہ اسد نے مسکراتے ہوئے جاوید سے کہا "مبارک ہو جاوید تمہارا ایک لاکھ کا انعام نکل آیا" "کیا؟" کیا جاوید کے منہ سے نکلا "اب تم مجھ سے مذاق کرنے آئے ہو" "نہیں جاوید..... میں سچ کہہ رہا ہوں" اسد نے کہا "جب تم نے میرا بونڈ مجھے دیا تھا تو میں نے تمہارا بونڈ دیکھنے کو مانگا تھا پھر تم ماسٹر صاحب سے کاپی لینے چلے گئے تھے۔ بس پتہ نہیں میرے جی میں کیا آئی کہ میں نے اپنا بونڈ تو تمہیں دے دیا اور تمہارا خود رکھ لیا۔ آج جب انعام نکلا تو ضمیر نے مجھ سے کہا کہ یہ میرا حق نہیں تمہارا ہے جو میں تمہیں دینے آیا ہوں مبارک ہو۔"

جاوید کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا اور وہ گرمجوشی سے اسد سے بغلگیر ہو گیا۔ اسد کے چہرے پہ سکون اور طمانیت کی روشنی پھیلی تھی۔ دوست کو سچی خوشی دے کر اسے محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے حقیقی انعام اسے اب ملا ہو۔

بجلی کا ڈسا مانگے نہ پانی

بجلی کے ننگے تار اور پلگ وغیرہ

سانپ سے زیادہ مہلک اور خطرناک ہیں۔ بجلی کے تاروں اور سوئچ بورڈ وغیرہ کو کھلونا نہ جانیئے۔ ان سب سے دُور رہیئے۔ بجلی کے سامان کو احتیاط سے استعمال کیجئے۔

اسکول کا زمانہ

امان اللہ نیّر شوکت

اسکول سے آنے والے بتا
اسکول کی حالت کیسی ہے
اِتنا ہی بتا دے تُو مجھ کو
اُستاد کی شفقت کیسی ہے
لڑکے بھی نئے آئے ہوں گے
اب اُن میں محبّت کیسی ہے

اسکول کے چھوٹے حصّے میں
اِک باغ لگایا تھا ہم نے
ہر پھُول کے بیج لگائے تھے
پھُولوں سے سجایا تھا ہم نے
وہ باغ ہمارا کیسا ہے
جو باغ لگایا تھا ہم نے

انگریزی کے گھنٹے میں اب بھی
کیا مُرغا بنایا جاتا ہے
اور مُرغا بنا کر پھر اُس پر
لڑکوں کو بٹھایا جاتا ہے
آنکھیں بھی دکھائی جاتی ہیں
ڈنڈا بھی چلایا جاتا ہے

کیا اب بھی شرارت کے پُتلے
ویسے ہی شرارت کرتے ہیں
اور اُن کو شرارت پر اب بھی
اس طرح ہی ڈنڈے پڑتے ہیں
کیا کھیل کے رسیا اب بھی وہاں
دیواروں کے اُوپر چڑھتے ہیں

کمرے ہیں وہی چھوٹے چھوٹے
یا پھر سے بنایا ہے اُن کو
ہیں فرش وہی میلے میلے
یا پھر سے دُھلایا ہے اُن کو
تصویریں وہی آویزاں ہیں
یا پھر سے سجایا ہے اُن کو

کیا ہوتا ہے ذِکرِ نیّر بھی
احباب کی محفل میں گاہے
کیا یاد بھی کروٹ لیتی ہے
ماحول کی منزل میں گاہے
اور ہُوک سی اُٹھتی ہے کہ نہیں
اے دوست ترے دل میں گاہے

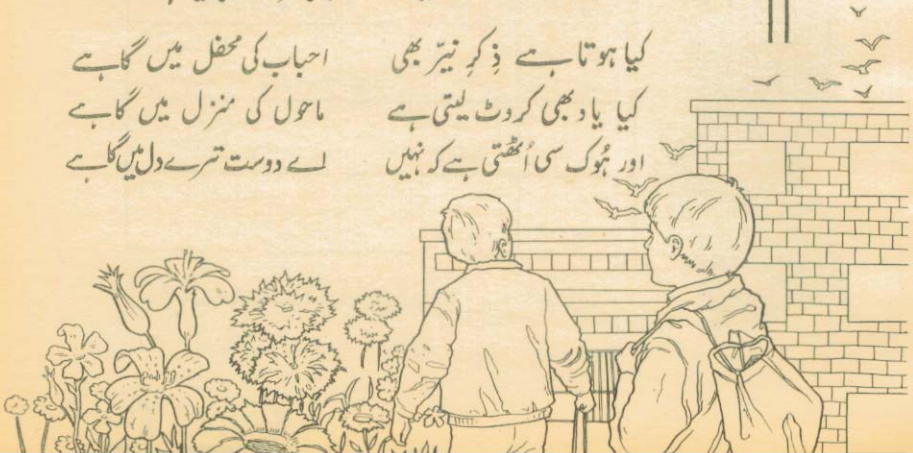

اچھی کتابیں

سرمایۂ حیات بھی رفیقِ زندگی بھی

طالبانِ
علم وادب کے لئے
گرین گائیڈ اکیڈمی کی شائع کردہ
نادر اور حسین کتابیں اب انتہائی خصوصی رعایت کے ساتھ دستیاب ہیں۔

اس پیشکش کا آج ھی فائدہ اُٹھائیے

یہ کتب آپ کے علمی خزانے میں گرانقدر اضافہ ہوں گی۔

کتاب	موجودہ قیمت مع ڈاک خرچ	بعد از رعایت مع ڈاک خرچ
۱ سب سے بڑا انسان ؐ۔ سیرتِ طیبہؐ پر سید نظر زیدی کی اہم تصنیف صدارتی ایوارڈ یافتہ۔ ڈی لکس ایڈیشن	۴۰ روپے	۲۵ روپے
۲ راہ نُما — قرآنی حکایات کا دلچسپ مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
۳ سفرِ مبارک — حجازِ مقدس کا سفر نامہ بھی راہنما بھی	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۴ تعلیم الاسلام — ۴ حصوں پر مشتمل۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات	—	صرف ڈاک خرچ ۴ روپے
۵ حق اسکواڈ — مہماتی کہانیوں کا سنسنی خیز مجموعہ	۱۰ روپے	۸ روپے
٦ کہنا بڑوں کا مانو — تعمیرِ سیرتِ اطفال کے لئے خوبصورت	۴ روپے	۳ روپے۔

آپ صرف ۵۰ روپے کا منی آرڈر بھجوا کر تمام کتب یکمشت بھی منگوا سکتے ہیں

پتا :۔ گرین گائیڈ اکیڈمی۔ ۱۱۲۔ ڈی سائیٹ کراچی نمبر ۱٦۔ فون نمبر ۲۹۹۱۷۸

آئیے
پین ہولڈر بنائیں

محمد صالح ارشاد

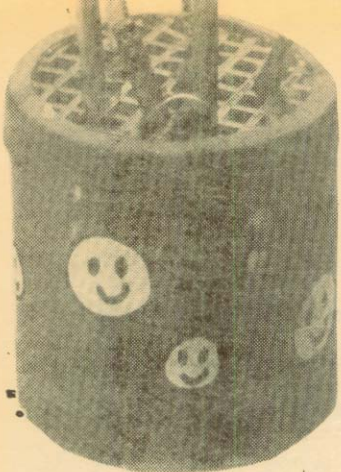

نیا سال شروع ہوگیا، اِس اعلان کے ساتھ کہ سالانہ امتحانات قریب آگئے ہیں۔ جن لوگوں نے سال بھر دل لگا کر پڑھائی کی ہوگی وہ یقیناً کامیاب ہوں گے۔ کامیابی کے بعد ان کو نئی جماعتوں میں بھیجا جائے گا، اور پھر نئی کتابیں اور پینسلیں وغیرہ خریدی جائیں گی۔ آپ کی نئی پینسلوں اور قلم کو ایک جگہ رکھنے کے لئے آج ہم آپ کو پینسل ہولڈر بنانے کی ترکیب بتاتے ہیں۔ یہ پینسل ہولڈر آپ اپنے گھر میں موجود بیکار اشیاء سے، پرانی یا بہت ہی کم قیمت میں تیار کر سکتے ہیں۔

ہولڈر بنانے کے لئے مندرجہ ذیل اشیاء درکار ہوں گی۔

سامان

۱۔ چھوٹا دُودھ کا ڈبہ جس کا ڈھکن پلاسٹک کا ہو۔
۲۔ لوہے کی خانے دار جالی۔
۳۔ گوند ۴۔ پینسل ۵۔ قینچی ۶۔ رنگ دار پینسلیں ۷۔ خوبصورت رنگ دار کاغذ۔

طریقۂ کار ۔ ایک چھوٹا دودھ کا ڈبہ لیں، جس کا ڈھکن پلاسٹک کا ہو۔ اگر آپ کے گھر میں نہ ہو تو کسی ایسے گھر سے بآسانی مل جائے گا جہاں شیر خوار بچہ موجود ہو۔

دُودھ کا ڈبہ لے کر اس کا ڈھکن اُتار لیں، اب اس ڈھکن پر شکل نمبر ۱ کے مطابق کوئی ایسا ڈبہ رکھیں، جس کا منہ ڈھکن سے چھوٹا ہو۔ اس بات کا خیال رکھیں کہ ڈھکن پر رکھے جانے والے ڈبے کا منہ بہت زیادہ چھوٹا نہ ہو۔ ڈبے کو ڈھکن کے بیچ میں رکھ کر اس کے گرد پینسل سے گول دائرہ بنا لیں۔

اب ڈبے کو ہٹا لیں اور ڈھکن کو شکل نمبر ۲ کے مطابق گولائی میں کاٹ لیں۔

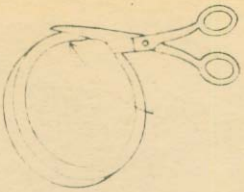

اب لوہے کی جالی جو عام طور پر کیلیں بیچنے والوں کی دکان پر ملتی ہے۔ لے کر کٹے ہوئے ڈھکن میں لگانے کے لئے اس حساب سے کاٹیں کہ جالی ڈھکن کے اندر بیٹھ جائے، شکل نمبر ۳، کے مطابق۔

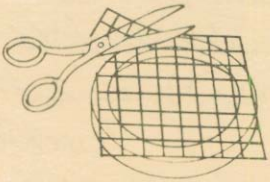

جالی کاٹنے کے بعد اس کو ڈھکن میں شکل نمبر ۴ کے مطابق گوند کی مدد سے لگا دیں۔

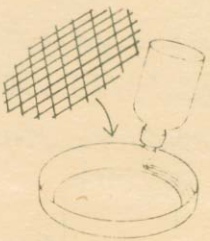

جالی چپکانے کے بعد ڈھکن کو ڈبے پر واپس لگا دیں۔

اب ڈبے پر چاہیں تو رنگ کر لیں جو بازار میں عام ملتا ہے۔ یا پھر چاہیں تو رنگین کاغذ گوند سے چپکا دیں۔ تاکہ ڈبہ خوبصورت لگے۔ اسی طرح ڈھکن کو بھی کاغذ یا رنگ سے خوبصورت بنالیں۔

اب شکل نمبر ۵ کے مطابق کاغذ کے گول ٹکڑوں پر پینسل کی مدد سے ۲ آنکھیں اور منہ بنا کر اس میں رنگ بھریں یا پھول پتیاں بنا کر ڈبے پر چپکا دیں۔

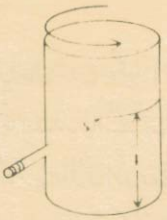

لیجیے آپ کا پینسل ہولڈر تیار ہے۔

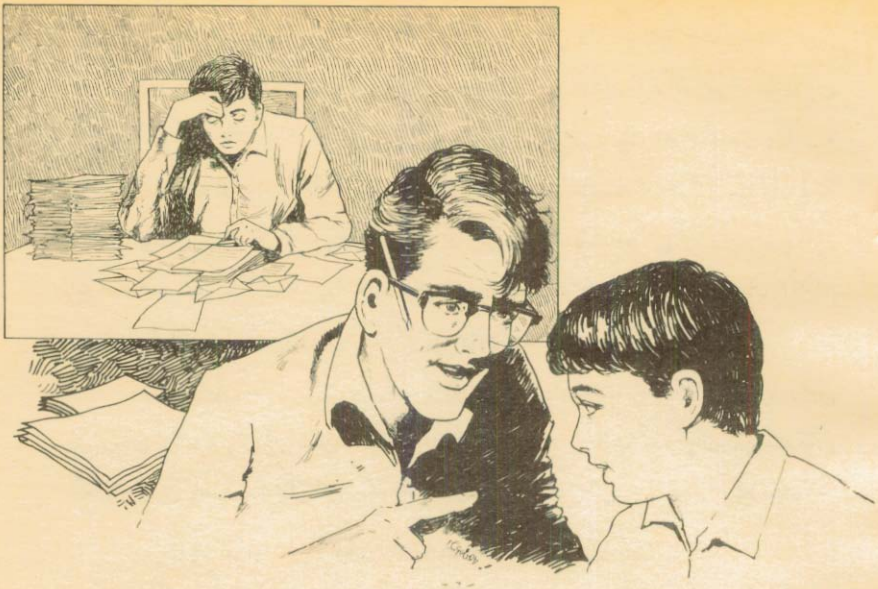

ایڈیٹر کی میز پر

محمد تنویر شعیب

عثمان نے جلدی سے جیب سے پیسے نکالے اور بک اسٹال والے کو تھمادئے، اور ساتھ ہی اپنا من پسند رسالہ اٹھالیا۔ پھر وہ جلدی جلدی مضمون کو پلٹنے لگا، کہانیوں کی فہرست پڑھی، مگر اس کا نام کہیں نظر نہ آیا، اس بار بھی اس کی کوئی کہانی شائع نہیں ہوئی تھی، وہ غصے سے پیر پٹختا ہوا گھر کی جانب چل پڑا، وہ راستے بھر سوچتا جارہا تھا کہ اگر اس کو ایڈیٹر بننے دیا جائے تو وہ اپنی تمام کہانیوں کو قابل اشاعت کی فائل میں لگادے گا اور "مظلوم" کو اس کا حق دے گا، گھر پہنچ کر اس نے جلدی جلدی ایک غصے سے بھرا خط ایڈیٹر کے نام لکھا، جس میں ایڈیٹر بننے کی درخواست بھی کی گئی تھی، پھر اس خط کو لفافے میں بند کر کے ڈاک کے سپرد کر دیا۔

کئی دنوں تک وہ بے چینی سے ایڈیٹر صاحب کے جواب کا منتظر رہا اور آخر ایک دن اس کے پسندیدہ رسالے کے ایڈیٹر صاحب کا جواب موصول ہو ہی گیا۔ جلدی جلدی کانپتے ہاتوں سے خط کو کھولا اور پڑھنا شروع کر دیا، آخری سطر پڑھ کر ختم کی تو اس کے ہاتھ خوشی کے عالم میں کپکپا رہے تھے۔

کیوں کہ ایڈیٹر صاحب نے اس کی خواہش کا احترام کیا تھا۔ اور اس کو مورخہ تین اگست کو اپنے دفتر بلایا تھا۔ آج اس کو اتنی خوشی نصیب ہوئی تھی کہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ آخر اللہ اللہ کر کے وہ دن آگیا۔ عثمان صبح صبح اٹھا نہا دھو کر بالوں میں کنگھی وغیرہ کی نئے کپڑے پہنے، اور خوشبو وغیرہ لگا کر وہ دفتر کی جانب روانہ ہوگیا، دفتر پہنچا تو ایک چوکیدار اس کو ایڈیٹر صاحب کے کمرے میں لے گیا، ایڈیٹر صاحب جیسے اس کے ہی منتظر تھے، وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور اس کو خوش آمدید کہا، ایڈیٹر صاحب نہایت سلجھے ہوئے انسان دکھائی دے رہے تھے، اور دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے والے بھی، جبھی تو آج وہ ان کے دفتر میں موجود تھا۔

"دیکھو میاں ..... اب یہ میز تمہارے حوالے ہے، اور تمام کہانیاں اور دوسری چیزیں بھی تمہارے پاس ہیں، میں شام تک آؤں گا ..... جب تک تم ان میں سے قابل اشاعت چیزیں الگ کر کے فائل میں رکھتے جانا اور باقی ردی کی ٹوکری میں ..... سمجھ گئے نا؟"

"جی ہاں جناب " عثمان نے نہایت سعادت مندی سے کہا۔

"اب دیکھتے ہیں تمہارا انتخاب کیسا رہے گا ..... اور ہاں ..... اگر کوئی خط غصے بھرا ہو تو اس کا جواب نہایت نرمی سے دینا۔"

"ٹھیک ہے جناب ! " عثمان نے برجستہ کہا، حالاں کہ وہ ایڈیٹر صاحب کی بات ٹھیک طرح نہیں سن رہا تھا کیوں کہ وہ ابھی تک اس خوشی کو ہی نہ سنبھال پایا تھا جو اسے میسر آئی تھی، پھر ایڈیٹر صاحب اس کو چند ضروری باتیں سمجھا کر چلے گئے کہ کون سی کہانیاں قابل اشاعت کی فائل میں لگانی ہیں، اور عثمان ان کی میز پر آبیٹھا۔ دائیں طرف بینچ پر ایک دبلا پتلا آدمی بیٹھا تھا، جو کمرے کے معائنے کے دوران اس کو نظر آیا تھا، عثمان سمجھ گیا کہ وہ چپراسی ہے، میز پر صرف چند لفافے پڑے تھے اور دائیں طرف فائلیں رکھی تھیں۔

"بھئی آج کی ڈاک تو لاؤ ..... " عثمان نے اس شخص سے کہا۔

"وہ جناب ..... ڈاک گیارہ بجے آتی ہے۔ "

عثمان نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی تو ابھی نو ہی بجے تھے۔ یعنی ڈاک دو گھنٹے بعد آئیگی، اس نے میز پر پڑے لفافوں میں سے ایک لفافہ اٹھایا، لفافہ کھولکر اندر سے مواد نکالا اور سب سے پہلے خط پڑھنا شروع کیا۔

"ڈیئر ایڈیٹر صاحب السلام علیکم

"امید ہے کہ آپ خیریت سے ہونگے، یہ میرا دسواں خط ہے اور ساتھ ہی گیارہویں کہانی بھی ..... اور اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ آپ کے پاس کوئی ردی کی ٹوکری نہیں، اسے تو لوگوں نے ویسے ہی بدنام کر رکھا ہے .....

عثمان نے اتنا پڑھ کر اطمینان سے سر ہلا دیا کیوں کہ یہ خط ڈھنگ کا لگ رہا تھا مگر جونہی اس نے آگے پڑھا اس کے ہوش اڑ گئے۔

"کیوں کہ میری اور مجھ جیسے نجانے کتنے بہن بھائیوں کی کہانیاں اور خطوط ایک ردی کی ٹوکری ہضم نہیں کر سکتی، یقیناً آپ نے کوئی بہت بڑی چیز اپنے قریب رکھی ہوئی ہے مثلاً کوئی بڑا ڈبہ یا ممکن ہے کہ آپکا دفتر ہی کسی "کچرا خانے" کے پاس قائم ہو۔"

"افوہ!" عثمان کے منہ سے نکلا اور خط اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔ پھر اس نے ڈرتے ڈرتے دوسرا لفافہ کھول، جو کافی پھولا ہوا معلوم ہو رہا تھا، لفافے میں سے جو جو چیزیں نکلیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔ "کہانیاں چھ عدد" ..... "خط ایک عدد" ..... "دلچسپ اور عجیب ہیبت ناک معلومات" ..... "لطائف" ..... "قلمی دوستی کے لئے تصویر" ..... اور ساتھ ساتھ سلسلہ وار ناول کی تمام اقساط بھی اس لفافے میں بھیجی گئیں تھیں۔

"یااللہ! یہ لفافہ ہے یا عمرو عیار کی زنبیل!" عثمان بڑبڑایا، پھر وہ ان تمام چیزوں کو پڑھنے لگا۔ کہانیوں میں مقصدیت کا فقدان تھا، خط میں کوئی جواب طلب بات نہ تھی، معلومات ایسی تھیں جن کو بچہ بچہ جانتا تھا، مثلاً قائد اعظم کا مزار کراچی میں ہے، انعامی مقابلے کی شرائط پوری نہیں کی گئی تھیں، لطائف ایسے جن کا نہ سر تھا نہ پیر، اور جن کو پڑھ کر ہنسی تو کیا مسکراہٹ بھی نہیں آتی تھی۔ قلمی دوستی کے لئے ارسال کی ہوئی تصویر یہ مہر اس طرح لگی تھی کہ شکل پہچاننا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ الغرض ساری چیزیں ردی کی ٹوکری کے قابل نہیں۔

پھر عثمان نے گھڑی کی طرف نگاہ ڈالی تو پورے گیارہ بج چکے تھے۔

"بھائی صاحب ..... ذرا آج کی ڈاک تو لے آیئے اور ساتھ ہی ایک چائے کا کپ بھی" چپراسی یہ سن کر باہر چلا گیا، تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور ایک بڑے سے تھیلے میں بند ڈاک میز پر الٹ دی۔ اور اس طرح لفافوں کا ایک مینار سا بن گیا تھا، ادھر چپراسی دوبارہ چلا گیا تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں چائے کا کپ تھا۔

"ارے صاحب جی کہاں چلے گئے؟" چپراسی نے تمام کمرے میں متلاشی نگاہیں دوڑائیں۔

"یہ رہا بھائی ..... یہاں پر لفافوں کے پیچھے!" عثمان کی منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔

"اچھا اچھا!!" یہ کہتا ہوا چپراسی پیچھے سے گھوم کر آیا اور عثمان کے ہاتھوں میں چائے تھما دی ، پہلے عثمان نے جلدی جلدی چائے ختم کی اور پھر دوبارہ کام میں جٹ گیا، ابھی تک کوئی قابل اشاعت تحریر بر آمد نہیں ہوئی تھی، اس نے ایک لفافہ کھولا اور خط نکال کر اللہ کا نام لے کر پڑھنا شروع کیا یہ کسی لڑکی کا خط تھا جو اس طرح لکھا گیا تھا۔

"انکل! اگر یہ خط آپ نے نہیں چھاپا تو اس کو میرا آخری خط سمجھئے گا، کیوں کہ اگر یہ خط چھپ نہ سکا تو میں مایوسی سے بیمار پڑ جاؤنگی..... اور اگر میں بیمار پڑ گئی تو میں مر جاؤنگی اور اگر میں مر گئی تو میری موت کے ذمہ دار آپ ہوں گے..... اس طرح یہ میرا آخری خط ہو گا"۔

اس قدر خوفناک دھمکی سن کر عثمان نے خط کو جلدی سے قابل اشاعت کی فائل میں رکھ دیا، پھر جلدی سے دوسرا لفافہ تھام لیا، اب عثمان کی کچھ ہمت بندھی تھی، اس لفافے میں بھی صرف خط تھا، عثمان نے خط پڑھنا شروع کیا۔ "ڈیئر ایڈیٹر صاحب! اسلام علیکم!"

"میں پچھلے آٹھ سال سے آپکا رسالہ پڑھ رہا ہوں اور یہ رسالہ....." "ہائیں!" عثمان کے منہ سے نکلا "رسالے کی تو ابھی دوسری ہی سالگرہ تھی اور یہ صاحب آٹھ سال سے پڑھ رہے ہیں۔ شاید یہ رسالہ کچھ زیادہ ہی ان کی نفسیات پر چھا گیا تھا، پھر عثمان نے اس کے آگے کچھ نہ پڑھا اور اس کو ردی کی ٹوکری کے حوالے کیا، پھر دوسرا لفافہ کھولا اس میں ایک عدد کہانی تھی جو کچھ اس طرح تھی۔

"کسی زمانے میں ایک بادشاہ اور ایک فقیرنی اپنے محل میں رہا کرتے تھے، ایک دن ایک ملکہ ان کے محل میں بھیک مانگنے آئی....."

"ارے کیا فضول بکواس ہے....." عثمان غصے سے بڑبڑایا۔ اور اس کہانی کو مٹھی میں بھینچ کر ردی کی ٹوکری کے حوالے کیا پھر ایک لفافہ اور کھولا، "مگر یہ کیا.....؟"

کہانی اس قدر چھوٹے چھوٹے حروف میں لکھی گئی تھی کہ پڑھنا مشکل ہو رہا تھا، پھر ایک سطر بھی نہیں چھوڑی گئی تھی اور نہ ہی ایک صفحہ، عثمان تو اس کو آرٹ کا ایک عظیم شاہکار سمجھ رہا تھا، مگر غور کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ کہانی ہی تھی، سو اس کو بھی ردی کی ٹوکری کے حوالے کیا، عثمان کی حالت ابتر ہوتی جا رہی تھی، اس وقت شام کے پانچ بج چکے تھے، عثمان کی آنکھوں سے آنسو نکلنا ہی چاہتے تھے۔ کہ ایڈیٹر صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔

"کیوں میاں!..... کیا صورتحال ہے.....!" ایڈیٹر صاحب نے عثمان کی غم زدہ شکل دیکھتے ہوئے کہا۔

"وہ ..... جناب ! ابھی تک صرف ایک خط قابل اشاعت نکلا ہے ..... میرا تو دماغ پھٹا جارہا ہے" ۔

عثمان کی اس بات پر ایڈیٹر صاحب کا ایک قہقہہ گونجا پھر ایڈیٹر صاحب نے کہا

"دیکھ لیا تم نے ! ..... جس کام کو تم آسان سمجھ رہے تھے وہ کتنا مشکل ہے؟"

"جی سر ! " عثمان نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"اور ہاں ! ..... کیا تمہیں یاد آیا کہ تمہاری تحریریں بھی ایسی ہی تحریروں میں شامل تھیں، کیوں کہ جو صورتحال ان کہانیوں کے ساتھ درپیش ہے وہی تمہاری کہانیوں کے ساتھ بھی تھی۔"

عثمان کو واقعی اب سب کچھ یاد آرہا تھا۔ اور وہ جتنا یاد کرتا اتنا ہی غم زدہ ہوتا اور ساتھ ساتھ شرمندہ بھی، "میں معافی چاہتا ہوں ایڈیٹر صاحب ! اب میں محنت کروں گا ..... اور ایک دن ضرور اچھی کہانی لکھنے میں کامیاب ہو جاؤں گا" یہ کہہ کر عثمان چل پڑا، لیکن وہ کوئی خواب نہیں دیکھ رہا تھا، یہ بالکل حقیقت تھی، اور اب عثمان واقعی محنت سے کام لے رہا ہے۔

پرندوں کو نہ ماریئے

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں

پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں

انہیں نہ ماریئے

انہیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

ادارہ آنکھ مچولی

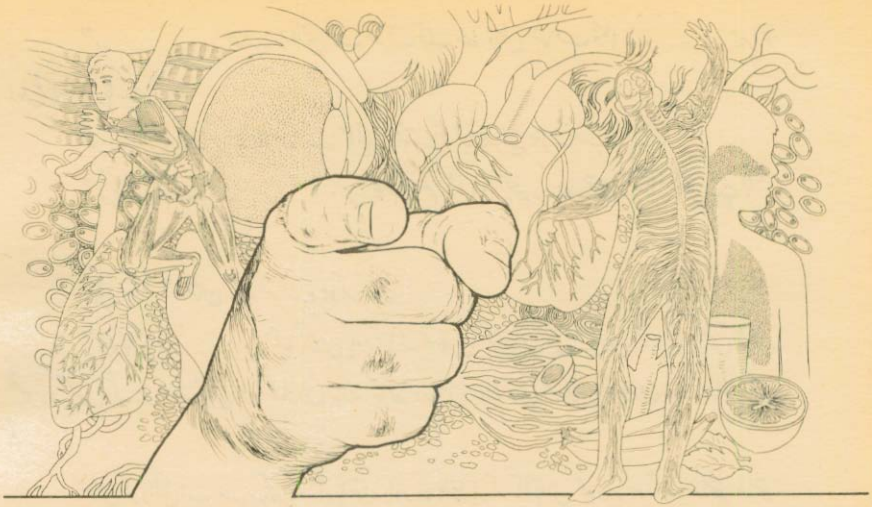

انسانی جسم ایک پیچیدہ دنیا

ساجد سعید

موجودہ سائنس طب کے میدان میں بھی بہت ترقی کر چکی ہے۔ انسانی جسم کے بارے میں اب تک سینکڑوں نئے انکشافات کئے جا چکے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ اپنے خون کے نظام ہی کو لیجئے۔ سب سے پہلے ۱۶۱۶ء میں ولیم ہاروے نے انسانی خون کے بارے میں یہ نظریہ وضع کیا تھا کہ ایک تندرست آدمی کے جسم میں اوسطاً ایک دن میں ایک میل کی رفتار سے خون گردش کرتا ہے۔ آپ نے اس بات کا اکثر مشاہدہ کیا ہوگا کہ خون کا رنگ سُرخ ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں ایک مرکب موجود رہتا ہے جسے سائنسی زبان میں ھیموگلوبن کہتے ہیں۔ خون ہمارے جسم میں شریانوں کے ذریعے دل سے جسم میں پھیلتا ہے اور وریدوں کے ذریعے جسم سے دل میں پہنچتا ہے۔ ہمارے خون میں سفید خلیے ہر وقت موجود رہتے ہیں جو ہمیں مختلف بیماریوں سے تحفظ فراہم کرتے ہیں اور اگر یہ کمزور پڑ جائیں تو دیگر موذی بیماریاں ہمارے جسم کے اندر فتح کے جھنڈے گاڑ دیتی ہیں۔ ایک صحت مند آدمی کے جسم میں چھ پونڈ خون ہوتا ہے۔ اکثر مریضوں کو جن کے اندر خون کی کمی واقع ہو جاتی ہے۔ مختلف گروپ کے خون اُن کو دیئے جاتے ہیں مثلاً (A، B، A B، O) وغیرہ جسم کا مضبوط ترین حصہ چھاتی میں دونوں پھیپھڑوں کے درمیان واقع ہوتا ہے یہ دو تہہ غلاف میں لپٹا ہوتا ہے۔ جی ہاں آپ نے صحیح پہچانا آپ کا اور ہمارا دل جس کے پھیلنے اور سکڑنے کی وجہ سے ہمارا

خون کا دوران جاری وساری رہتا ہے۔ یہ مخروطی شکل کا ایک چھوٹا سا عضو ہے جس کی چھوٹی سی خرابی اور نقص انسان کو شدید تکلیف دہ بیماریوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ تندرست آدمی کا دل پورے دن میں ۹۲ ہزار نو سو ساٹھ مرتبہ دھڑکتا ہے دل کے چار خانے ہوتے ہیں۔ دل کی طرح ہمارے جسم کے کارخانے میں ایک عضو ایسا بھی ہے جو اعصاب کے کروڑوں خلیوں سے مل کر بنا ہے۔ یہ وہ عضو ہے جس کا تعلق ہمارے ذہن سے ہے یعنی "دماغ" جسم کو ساری اطلاعات اسی حصے کے ذریعے پہنچتی ہیں۔ دماغ کی پشت پر ایسے اعصاب واقع ہیں جن کا ہماری زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔ جن میں ذرا سی خرابی انسان کو دیوانہ بنا دیتی ہے۔ یہ انسانی جسم کا سب سے پیچیدہ نظام ہے۔ اسی دماغ کی بدولت آج انسان نے سینکڑوں ایجادات کی ہیں۔

ہڈیاں انسانی جسم کے پیچیدہ نظام میں مختلف کام سرانجام دیتی ہیں۔ جسم انسانی میں کُل دو سو چھ ہڈیاں ہوتی ہیں جس میں پسلیوں کی تعداد ۲۴ ہے یہ ہڈیوں کے وہ جوڑے ہیں جو پیچھے کی طرف پشت کے ساتھ جُڑے ہوتے ہیں۔ پسلیوں کی بیرونی سطح پر سینے کے عضلات لگے ہوتے ہیں۔ ان کا سب سے اہم کام دل اور پھیپھڑوں کی حفاظت کرنا ہے۔ ان میں بڑی لچک ہوتی ہے جس کی بدولت یہ دل اور پھیپھڑوں کو صحیح حالت میں رکھتی ہیں۔ انسانی جسم میں کمزور ترین ہڈی ہنسلی کی ہڈی ہے اور مضبوط ترین پنڈلی کی ہڈی۔ انسانی جسم میں گوشت کے وہ ٹکڑے جو ہڈیوں کو حرکت دینے میں مدد دیتے ہیں عضلات کہلاتے ہیں۔ ہمارے جسم کی تمام حرکات عضلات کے سُکڑنے اور پھیلنے سے ہوتی ہیں۔ انسانی جسم کا نصف حصہ عضلات پر مشتمل ہے۔ اگر آپ کسی سے گفتگو میں مصروف ہیں تو اُس وقت آپ کے جسم کے ۷۰ عضلات اپنے کام میں مصروف ہوتے ہیں۔ انسانی دل کے دائیں اور بائیں جانب دو پھیپھڑے موجود ہیں۔ زندگی کے لئے توانائی ضروری ہے اور یہ ہضم شُدہ غذا کی اکسیڈیشن سے حاصل ہوتی ہے۔ انسانی جسم میں سانس کے دوران آکسیجن بدن میں جذب ہوتی ہے اور کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج ہوتی ہے۔ اور اس عمل میں پھیپھڑے اپنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انسان کا دایاں پھیپھڑا بائیں پھیپھڑے سے بڑا ہوتا ہے۔ ان میں خون کی باریک نالیاں بکثرت ہوتی ہیں جنہیں کیلریز کہتے ہیں۔ عمل تنفس یا سانس کے نظام میں جلد بھی اپنا اہم کردار کرتی ہے۔ انسان کی جلد اپنے غدود کی رطوبت اور آبی ماحول کی وجہ سے ہر وقت نم رہتی ہے۔ جلد کی تین تہہ ہوتی ہیں۔ انسانی جلد کا وزن پورے جسم کا سولہ فیصد ہوتا ہے۔

انسانی جسم میں ایک ایسا چھوٹا سا عضو جس سے آپ دنیا کی ہر چھوٹی بڑی چیز دیکھ سکتے ہیں۔ یہ کیمرے کے اصول پر کام کرتی ہے۔ جی ہاں، آنکھ۔ کارنیا، آئیرس، کورائیڈ، ریٹنا وغیرہ اس کے خاص حصے ہیں جو مختلف زاویوں میں اپنا کام سرانجام دیتے ہیں۔ کان بھی ہمارے جسم کا ایک عضو ہے یہ تین حصّوں سے مل کر بنا ہے۔ اندرونی کان جو نازک آلات سماعت پر مشتمل ہے۔ اس کی حفاظت بیرونی کان سے ہوتی ہے اور یہ دونوں کان آپس میں سماعی نالی سے

ملے ہوتے ہیں۔ جب کان کی بیماریاں یا تکالیف ہوتی ہیں تو کان میں پچکاری کرنے سے آرام آجاتا ہے۔ ناک بھی ہمارے نظامِ جسم کا ایک اہم کارندہ ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے سانس لیا جاتا ہے۔ نزلہ زکام سے ناک کی جھلی پر ورم آجاتا ہے۔ قدرت نے ناک کو منہ کے اُوپر اس لئے تخلیق کیا ہے تاکہ آپ جو چیز بھی تناول کریں پہلے اُس کو ناک سے سُونگھیں کہ کھانے والی چیز قابلِ غذا ہے کہ نہیں۔ سانس کی نالی میں ایک جھلی ہوتی ہے جس کے اُوپر چھوٹے چھوٹے بال ہوتے ہیں جو پھیپھڑوں کے اندر جاتی ہواؤں کو صاف کرتے ہیں۔

ہمارے سر کے بال عموماً دو رنگ کے ہوتے ہیں۔ اندازہ ہے کہ سر کے بھورے بالوں کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار تک ہوتی ہے۔ تقریباً ڈھائی مہینے میں ہمارے سر کے بال ایک انچ بڑھتے ہیں۔ آج سے ہزاروں سال پہلے چین اور جاپان میں بالوں کی رسّیاں بنائی جاتی تھیں۔ اُس زمانے کی رسّی آج بھی لندن کے عجائب گھر میں موجود ہے۔ یہ رسّی کئی ہزار فٹ لمبی اور دو ٹن وزن کی ہے۔ گرمیوں میں بالوں کی بڑھنے کی رفتار سردیوں سے نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا۔ کہ لوگوں کے سر کے بال چھوٹی عمر میں اُڑ جاتے ہیں۔ جس کی وجہ وٹامن ایچ کی کمی ہوتی ہے۔ وٹامن میں وٹامن اے کی کمی سے وزن گرنے لگتا ہے، کھال اور بینائی میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے۔ وٹامن بی کی کمی سے مرگی اور اعصابی شکایتیں پیدا ہوجاتی ہیں۔ وٹامن سی کی کمی سے نزلہ زکام اور دانتوں کی تکالیف پیدا ہوجاتی ہیں۔ یہ تمام حیاتین مچھلی، انڈا، گوشت، سبزی پھل، مکھن وغیرہ میں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ الغرض ہمارا جسم جس میں اُس کے مختلف اعضا اپنے اپنے کام میں مشغول ہیں۔ ہمارے لئے خُدا کی طرف سے بہت بڑا عطیہ ہیں۔ انسان جب بیماری میں مُبتلا ہوتا ہے تو وہ فوراً ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ اور مختلف ادویات پر اپنے پیسوں کا ضیاع کرتا ہے۔ مثلاً ناک و کان کی بیماریاں، دل کی بیماریاں، ہاتھ پاؤں وغیرہ کی مختلف بیماریاں، انسان اگر چاہے تو ان بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ روزانہ پابندی سے ورزش، اچھی غذا اور مناسب ہوا انسان کی صحت پر کافی اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ صحت مند دماغ کے لئے صحت مند جسم کا ہونا ضروری ہے۔

"غضب خدا کا تم اب میرے پاس آئے ہو۔" غصہ ور ڈاکٹر نے کہا۔ "مجھ سے پہلے بھی تو کسی کو دکھایا ہوگا؟"

مریض "جی نہیں میں کیمسٹ کے پاس چلا گیا تھا"۔

ڈاکٹر "کھلی جہالت ہے۔ کیمسٹ ڈاکٹر تو نہیں ہوتا"۔ وہ علاج کرنا کیا جانے تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خیر بتاؤ اس نے تمہیں کیا احمقانہ مشورہ دیا؟"

مریض "جی..... اس نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے"۔

مشہود شہزاد۔ نارتھ ناظم آباد کراچی

غرور کا سر نیچا

شاھنواز فاروقی

کہتے ہیں کسی زمانے میں یونان کے اندر انسانوں کی تین مختلف نسلیں آباد تھیں۔ ایک نسل ہمارے اور آپ کی طرح کے عام انسانوں کی تھی۔ جبکہ دوسری نسل طاقتور اور قدوقامت کے اعتبار سے عظیم الجثہ انسانوں پر مشتمل تھی۔ اس نسل کے افراد اپنے بڑے ڈیل ڈول کے باعث دیو کہلاتے تھے۔ یونان میں آباد تیسری نسل کے لوگ اگرچہ قدوقامت میں دیونسل کے لوگوں سے چھوٹے تھے مگر ان کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ طاقت دے رکھی تھی۔ اور نہ صرف یہ بلکہ ان کو خدا نے بعض ایسی صلاحیتیں بھی دے رکھی تھیں جو دوسرے لوگوں کے پاس نہیں تھیں۔ عام انسانوں کی نسل یونان کے شہر مڈگارڈ میں آباد تھی۔ جبکہ دیو انسانوں کی نسل اُنگارڈ اور طاقتور ترین انسانوں کی نسل اسگارڈ میں رہتی تھی۔

طاقتور ترین انسانوں کی نسل کے لوگوں کو مہم جوئی اور خطرات سے کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ ایک روز اس نسل کے تین افراد نے بلند قامت لوگوں کے شہر اُنگارڈ کے سفر کی ٹھانی تاکہ خطرات سے نبرد آزما ہو کر اپنے شوق کی تسکین کر سکیں۔

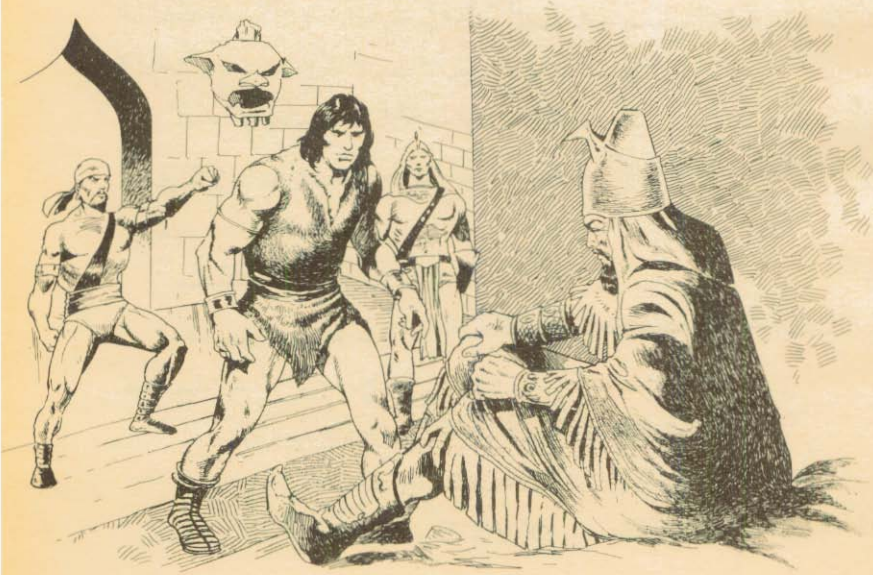

ان تینوں مہم جوؤں میں ایک تو اسگارڈ کے بادشاہ کا بیٹا تھا۔ جس کا نام بجلی تھا۔ اس کے پاس ایک بہت وزنی ہتھوڑا تھا۔ خدا نے اُسے یہ صلاحیت دی تھی کہ وہ یہ ہتھوڑا جس چیز پر مارتا وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی۔ بجلی جب کبھی اپنے ہتھوڑے کو زمین پر دے کر مارتا تو زمین لرز جاتی۔

دوسرے مہم جُو کا نام لال تھا۔ اُس کا نام لال اس لئے پڑا تھا کہ اُس کے چہرے کا رنگ لال تھا۔ لال بلا کا ذہین، چالاک اور عیار تھا۔ اس کے علاوہ مشہور تھا کہ وہ دنیا کے تمام انسانوں سے زیادہ تیزی کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہے۔

تیسرے مہم جُو کا نام تھیلر تھا۔ اس کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ یہ دنیا کے تمام جانداروں سے تیز دوڑ سکتا تھا۔ تینوں کو اپنی صلاحیتوں کے باعث خود پر بڑا فخر محسوس ہوتا جو اکثر شدید غرور میں بدل جاتا۔

طاقت ور ترین نسل کے لوگوں کی یہ روایت تھی کہ وہ بھیس بدل کر سفر کرتے تھے۔ چنانچہ اس بار بھی یہ تینوں مہم جُو بھیس بدل کر گھروں سے سفر پر نکلے اِس لئے اُنہیں کسی نے نہیں پہچانا۔

تینوں طویل سفر کے بعد جیسے ہی عظیم الجُثہ انسانوں کے شہر انگارڈ کے قریب پہنچے تو ایک عظیم الجُثہ انسان نے اُن کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اور اُنہیں لے کر انگارڈ شہر کی طرف روانہ ہُوا۔

تھوڑی دیر بعد شہر کا حصہ شروع ہو گیا۔ شہر بڑا ہی عجیب و غریب تھا۔ شہر کی دیواریں اتنی بلند تھیں کہ بجلی اور اُس کے دونوں ساتھی دیواروں کی اُوپری سطح کو بڑی مشکل سے دیکھ پا رہے تھے۔ انگارڈ کے بادشاہ نے ان تینوں کا خیر مقدم کیا۔ اس کے باوجود کہ انہوں نے بھیس بدل رکھا تھا۔ بادشاہ نے اُنہیں پہچان لیا۔

"اگر میں غلطی نہیں کر رہا ہوں"۔ بادشاہ نے عیارانہ مسکراہٹ کے ساتھ بجلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تو آپ یقیناً بجلی ہیں۔ اس دنیا کے طاقت ور ترین انسان۔ مگر میرے نزدیک انتہائی کمزور"۔ اتنا کہہ کر بادشاہ کُو کا پھر تھوڑی دیر بعد بولا۔

"مجھے بتائیے کہ آپ تینوں کس ہُنر میں ماہر ہیں"۔

اسگارڈ کے باشندوں یعنی طاقت ور ترین انسانوں کو انگارڈ کے بادشاہ کا حقارت آمیز لہجہ پسند نہ آیا کیونکہ انہیں ہمیشہ تمام لوگوں نے عزت و تکریم کے ساتھ پکارا تھا۔

"میں دنیا کے تمام جانداروں سے تیز دوڑ سکتا ہوں"۔ تھیلر نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا۔

"تم یقیناً اپنے شہر کے سب سے تیز دوڑنے والے ہوں گے مگر اس شہر میں دیو قامت لوگ رہتے ہیں تم یہاں ایک سُست رفتار آدمی ثابت ہو گے"۔ یہ سُنتے ہی تھیلر کا چہرہ مارے غصے کے تمتما اُٹھا اور وہ تیزی کے ساتھ ایک

بڑے سے میدان کی طرف چل پڑا تاکہ انگارڈ کے کسی آدمی کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کر سکے۔

انگارڈ کے بادشاہ نے لوگی نام کے ایک آدمی کو اشارہ کیا کہ وہ تھیلر کے ساتھ دوڑ کا مقابلہ کرے۔

تھوڑی دیر بعد دوڑ شروع ہوئی۔ تھیلر ہوا کی طرح دوڑا مگر لوگی اُس سے بہت آگے نکل گیا اور نتیجتاً دوڑ جیت گیا۔

"جی لال صاحب آپ کس چیز میں مقابلہ کرنا پسند کریں گے۔ انگارڈ کے بادشاہ نے دوڑ کے اختتام پر لال کی طرف دیکھ کر طنزاً کہا۔

"میں دنیا کے کسی بھی انسان سے زیادہ تیزی کے ساتھ کھانا کھا سکتا ہوں۔ اور میں تمہارے کسی بھی شخص کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار ہوں" لال نے انگارڈ کے بادشاہ کو چیلنج کیا۔

انگارڈ کے بادشاہ نے شوکی نام کے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ لال کے ساتھ کھانے کا مقابلہ کرے۔

گوشت اور ہڈیوں سے بھری ہوئی ایک بہت بڑی کڑاہی میدان کے بیچ میں رکھ دی گئی۔ لال اور شوکی اشارہ پاتے ہی گوشت پر پل پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کڑاہی گوشت سے خالی ہو گئی۔ مگر ہُوا یہ کہ لال نے تو صرف گوشت کھایا مگر شوکی نے ہڈیاں اور اپنی طرف کی کڑاہی بھی ہضم کر لی۔ اور یُوں مقابلہ جیت لیا۔

"جی بجلی صاحب ... دنیا کے طاقتور ترین انسان۔ اب آپ بتائیے کہ آپ کس چیز میں مقابلہ کرنا پسند کریں گے؟"

بجلی جو اپنے دوستوں کی بُری طرح ہار پر سخت شرمندہ تھا اور غصے میں بھرا بیٹھا تھا بپھر کر بولا۔

"میں کچھ پینے کا مقابلہ کروں گا" بادشاہ نے اپنے آدمیوں کو پانی سے بھرا ہُوا ایک اتنا بڑا پیالہ لانے کو کہا جو پیالے سے زیادہ کوئی بڑا سا تالاب نظر آتا تھا۔

"ہمارے یہاں کے اچھے پینے والے اس پیالے کو ایک گھونٹ میں ختم کر لیتے ہیں۔ ہمارے عام افراد اسے دو گھونٹ میں اور بچے تین گھونٹ میں ختم کر لیتے ہیں۔ آپ بھی اسے تین گھونٹ میں ختم کر کے دکھائیں!"

بجلی نے غور سے پیالے کی طرف دیکھا۔ اُسے لگا کہ وہ بآسانی اُس پیالے کو تین گھونٹ میں ختم کر دے گا۔ بجلی نے پیالے سے منہ لگا کر ایک لمبا گھونٹ بھرا۔ اور گھونٹ بھر کر پیالے کو دیکھا تو حیرت سے اُس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

پیالے میں سے ذرا سا بھی پانی کم نہیں ہوا تھا۔ بجلی نے افسوس کے ساتھ گہرا سانس لیا اور پھر دوسرا گھونٹ بھرنے کے لئے پیالے پر جھکا۔ اس بار اُس نے پہلے سے بھی لمبا گھونٹ بھرا۔ یہاں تک کہ اُسے لگا کہ اُس کا جسم گلے تک پانی سے بھر گیا ہے اور اُس کا دل پانی کے دباؤ سے پھٹا چاہتا ہے، مگر جب اُس نے پیالے کو منہ سے ہٹا کر دیکھا تو اُسے لگا کہ اُس نے ابھی تو بہت تھوڑا سا پانی پیا ہے۔ یہ دیکھتے ہی بجلی غصے سے بھر گیا۔

اِس بار اُس نے سوچا "میں پیالے کو خالی کر کے ہی چھوڑوں گا" چنانچہ اس بار اُس نے پیالے سے منہ لگا کر

اپنی زندگی کا سب سے لمبا سانس کھینچا اور جب اُسے لگا کہ پیالے کا سارا پانی ختم ہو چکا ہو گا تو اُس نے پیالے کو رکھ کر اُس میں جھانک کر دیکھا۔ ابھی صرف آدھا پیالہ ہی خالی ہُوا تھا۔ بجلی مقابلہ ہار چکا تھا۔

"جناب! آپ تو ہمارے بچّوں سے بھی زیادہ کمزور نکلے۔" انگارڈ کے بادشاہ نے طنزاً کہا اور پھر بولا۔

"اب آپ کس چیز کا مقابلہ کرنا پسند کریں گے؟"

"آپ ہی بتائیے؟" بجلی نے کہا۔

"ہمارے یہاں ایک بہت آسان کھیل کھیلا جاتا ہے۔ درحقیقت یہ کھیل ہمارے بچّے کھیلتے ہیں۔ کھیل یہ ہے کہ بچّے میری بلّی کو زمین سے اُٹھاتے ہیں"۔ انگارڈ کے بادشاہ نے کہا۔

بادشاہ کے یہ کہتے ہی ایک بھُوری بلّی کُودکر بجلی کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بجلی نے آگے بڑھ کر بلّی کو گود میں اُٹھانے کی کوشش کی۔ اچانک بلّی کا سائز بڑھنے لگا۔ اور وہ تیزی کے ساتھ بلند ہونے لگی۔ بجلی نے بڑی کوشش کی مگر وہ بلّی کا صرف ایک پاؤں ہی زمین سے اُٹھا سکا۔

"ہا ہا ہا" بادشاہ زور سے ہنسا "ارے تم تو بلّی بھی نہیں اُٹھا سکتے!" بادشاہ کے اس ذلیل کرنے والے انداز نے بجلی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ وہ چیخ کر بولا۔

"میں بلّی کے بجائے تمہارے کسی آدمی سے لڑنا چاہتا ہوں۔ ہمت ہے تو کسی کو بھیجو مجھ سے لڑنے کے لئے!"

"میرے خیال میں تمہارے جیسے کمزور آدمی کے ساتھ میرا کوئی بھی جوان لڑنا پسند نہیں کرے گا۔ البتہ یہاں ایک بوڑھی عورت موجود ہے وہ شاید تم سے لڑنا پسند کرے۔ بادشاہ نے اپنے لہجے کو مزید زہر آلود بناتے ہوئے کہا۔

"میں عورت سے نہیں لڑ سکتا!" بجلی نے جواب دیا۔

"شاید تم ڈر گئے ہو!" بادشاہ نے کہا۔

یہ سنتے ہی بجلی آگے بڑھا اور بڑھیا کی کلائی کو کس کر پکڑ لیا اور اُسے زور سے دبانے لگا مگر بڑھیا ٹس سے مس ہوئی اور نہ اُس کے چہرے پر تکلیف یا پریشانی کے آثار ظاہر ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لوہے کی بنی ہو۔ جب بجلی بڑھیا کو اُس کی جگہ سے ہلا بھی نہ سکا تو بڑھیا نے ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ بجلی حیرت کے ساتھ بڑھیا کو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بڑھیا سے بھی شکست کھا چکا تھا۔

بجلی اپنی نسل کی مسلسل بے عزّتی پر مارے شرم کے زمین میں گڑا جا رہا تھا۔

اگلی صبح بجلی اور اُس کے ساتھی گھر واپسی کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ دیووں کا بادشاہ انہیں شہر کے دروازے تک چھوڑنے آیا...

"کیا تم اب بھی سمجھتے ہو کہ تم دنیا کے طاقت ور ترین آدمی ہو؟ یا اب تم یہ بات اچھی طرح جان چکے ہو کہ دنیا میں تم لوگوں سے بھی زیادہ طاقت ور لوگ موجود ہیں۔" بادشاہ نے شہر کے دروازے کے باہر تینوں کو خدا حافظ کہنے سے پہلے اُن سے پُوچھا...

بجلی ابھی تک شرم اور غصّے کے احساس سے بھرا ہُوا تھا۔ مگر اُسے بہر حال سچ بولنا تھا۔

"یقیناً تمھارے لوگ مجھے دُنیا کا کمزور ترین آدمی سمجھیں گے اور میرا مذاق اُڑائیں گے لیکن میں اقرار کروں گا کہ آپ کے لوگوں نے ہمیں شکست دی۔"

بادشاہ بجلی کی صاف گوئی اور منکسر المزاجی سے بہت خوش ہُوا اور بولا۔

"شرمائیے مت۔ آپ لوگوں نے اتنی خراب کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا جتنا کہ آپ سوچ رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے آپ کو جادو کے زور سے ہرایا ہے۔"

"جب آپ لوگ ہمارے شہر میں داخل ہوئے تھے تو میں سخت خوفزدہ ہو گیا تھا۔ کیونکہ مجھے آپ لوگوں کی بے مثال قوّت کے بارے میں اچھی طرح علم تھا۔ چنانچہ آپ لوگوں کو ہر مقابلے میں ہم نے جادو کے ذریعے شکست دی۔ لال نے بہت تیزی کے ساتھ کھانا کھایا مگر اُس کا مقابلہ کرنے والا شوکی دراصل انسان نہیں تھا بلکہ وہ آگ تھی۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ دنیا میں آگ سے زیادہ تیزی کے ساتھ چیزوں کو کوئی اور نہیں کھا سکتا۔ آپ کا دوست تھیلر ہَوا کی طرح تیزی کے ساتھ دوڑا تھا۔ مگر اُس کے ساتھ دوڑنے والا لوگی انسان نہیں بلکہ ایک خیال تھا۔ اور آپ کو یہ تو معلوم ہی ہو گا کہ تیز رفتاری میں خیال سے کوئی نہیں جیت سکتا اور آپ نے تو بجلی صاحب کمال ہی کر دیا۔ آپ نے پیالے میں سے جتنا پانی پیا۔ اُتنا تو کسی ندیا میں بھی پانی نہیں ہوتا۔ ہم جادُو کے ذریعے اُس میں مسلسل پانی ڈالتے رہے تھے اور بلّی تو ایک ایسی بلا تھی جس کو کوئی اُٹھا تو کیا ہلا بھی نہیں سکتا۔ مگر آپ نے اُس کا ایک پیر اُٹھا کر ہمیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ اور وہ بوڑھی عورت تو عُمر تھی اور آپ یہ تو جانتے ہی ہوں گے کہ عُمر سے آج تک کوئی نہیں جیت سکا ہے۔ چنانچہ میرے عزیز دوست غم نہ کرو۔ ہم نے تمہیں اس طرح کی حرکتوں سے شکست دی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں ایک دوسرے سے جُدا ہو جانا چاہیے۔ مجھے توقع ہے کہ آپ اب کبھی دوبارہ ہمارے شہر میں داخل نہیں ہوں گے اور اگر کبھی آپ نے ایسا کیا تو میں آپ کو جادُو کے زور سے قابُو کروں گا کیونکہ میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔"

بجلی اور اُس کے دوست واپس اپنے شہر اسگارڈ آ گئے۔ اُنہیں اپنی صلاحیتوں پر پہلے سے بھی زیادہ اعتماد ہو گیا تھا، مگر ایک اہم بات یہ ہوئی تھی کہ اب وہ تینوں پہلے سے زیادہ منکسر المزاج ہو گئے تھے (انگریزی کہانی سے ماخوذ)

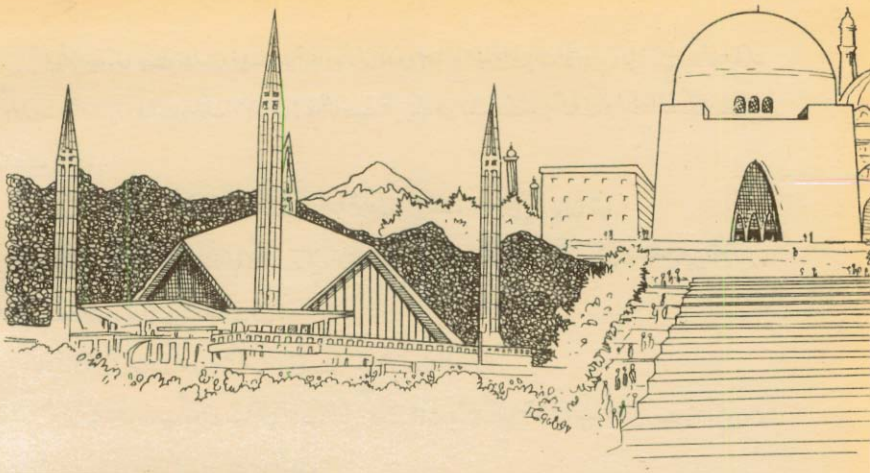

شعر میں شہر کا نام

ان شعروں میں کچھ شہروں کے نام چھپے ہیں، ڈھونڈیے

(۱)
مفت میں کڑھنے سے کیا حاصل بھلا
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

(۲)
ساس بہو سے جلتی بھی ہے اور ہے دل کی چھوٹی بھی
آپ ہی کھایا سارا قورمہ دی نہ اُسے اک بوٹی بھی

(۳)
پہلا روزہ قمر نے رکھا ہے !
سب کو افطار کا بلاوا ہے !

(۴)
دُور کر دو دل سے جن بھوتوں کا ڈر
سوؤ چادر بے تامل تان کر

(۵)
ہار کر آخر کو ہم پیدل ہی میلے تک گئے
آدمی تھے ٹھٹ کے ٹھٹ تانگا چلے تو کیا چلے

(۶)
لکڑیاں تھیں اِس قدر سیلی ہوئی
جلتے جلتے آگ رہ رہ کر بجھی !

(۷)
آیا تھالے کے تحفے جو بڈھا کہاں گیا
کہتی ہے روزی اگلے بڑے دن پہ آئے گا

(۸)
بالکل غلط ہے کہنا پرستاں کو پرستاں
ہے ٹھیک گلستان و گلستان بولنا

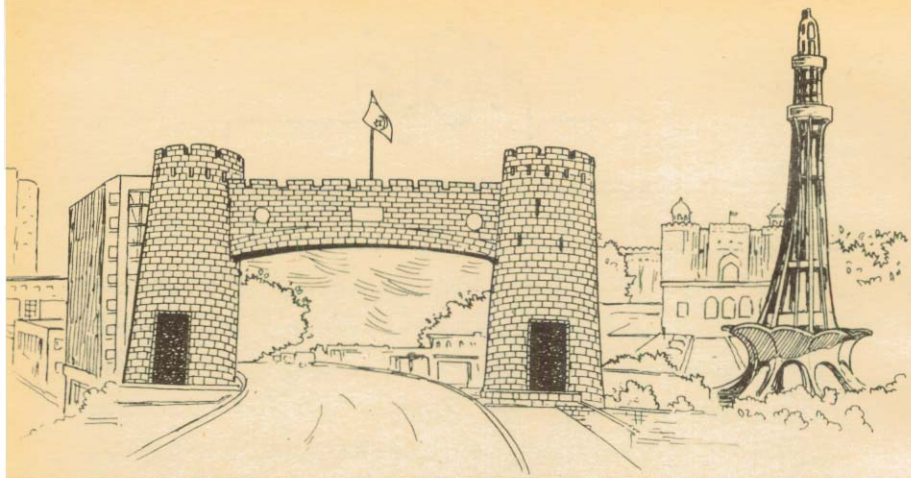

آنکھ مچولی کے ذہین قارئین کے لئے جناب شان الحق حقی کا ایک خوبصورت تحفہ

(۹)

دو دِن تو پرہیز کرو یہ چیزیں ابھی نہ کھاؤ
کھانس رہے ہو، کھٹا ہے یہ، امجد دہی نہ کھاؤ

(۱۰)

بینگنوں کا پکاتی ہے سالن ،
ڈنڈیوں کے سمیت باورچن ،

(۱۱)

جانے کتنے لوگوں نے اُسے مل کر تانا ہوگا
اس تنبو لمبے لہکارے میں اِک جلسہ ہوگا

(۱۲)

بھائی صاحب پیر کے دِن آئیں گے
اور منگل کو اٹاوے جائیں گے

(۱۳)

کوئی جُوتا اور دکھلائیں ذرا!
ڈھیلا ڈھیلا سا ہے پیر اس میں مرا

حل

۱ لاہور ۲ مدینہ ۳ کابل ۴ ملتان
۵ ٹھٹہ ۶ آگرہ ۷ ڈھاکہ ۸ استانبول
۹ جدّہ ۱۰ لنڈن ۱۱ استنبول ۱۲ کوئٹہ
۱۳ پیرس

انجانی مُہم

محمد نوید مرزا

صفدر منصور اور ذیشان آپس میں گہرے دوست ہیں۔ لاہور جانے کے لئے وہ کراچی اسٹیشن سے ٹرین پر سوار ہوئے دوران سفر ایک پراسرار شخص جس نے نیلا کوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔ ان سے باتیں کرنے لگا۔ دوران گفتگو منصور کے ہاتھ میں ذیشان نے ایک پرچی تھمائی جس پر کوڈورڈ کا ایک جملہ تحریر تھا۔ باتھ روم جاکر منصور نے پرچی دیکھی تو اس پر درج تھا کہ..... ھو بڈ ناٹواگ ہوام یا..... یعنی یہ آدمی ٹھیک نہیں ہے۔..... منصور ہاتھ دھو کر باتھ روم سے نکلا تو اسے شدید حیرت ہوئی کیونکہ نیلے کوٹ والا غائب تھا لیکن اس کا کوٹ نشست پر موجود تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اپنا کوٹ چھوڑ کر سوٹ کیس لے کر روانہ ہو گیا۔ اچانک منصور نے اپنے سامان کو دیکھا تو پتہ چلا کہ نیلے کوٹ والا اپنا سوٹ کیس چھوڑ کر ان کا سوٹ کیس لے گیا ہے۔ اتنے میں ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی۔ ٹرین تھوڑی دیر کے لئے اسٹیشن پر رکی اور پھر چل پڑی۔ جس علاقے سے ٹرین گزر رہی تھی یہ ملٹری کا علاقہ تھا۔ ذیشان نے اپنا شک ظاہر کیا کہ ممکن ہے نیلے کوٹ والا مشتبہ شخص چیکنگ کے خوف سے یہ سوٹ کیس یہاں چھوڑ گیا ہو۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ پولیس انسپکٹر سامان کو شک بھری نظروں سے دیکھتا ہوا وہاں آپہنچا۔ پولیس انسپکٹر سوٹ کیس اور نیلے کوٹ کو دیکھ کر ٹھٹکا۔ اور تلاشی لینا چاہی، مگر ذیشان نے انسپکٹر کو ایک کارڈ دیتے ہوئے بتایا کہ وہ کرنل رحمان کے پرائیویٹ سیکرٹ سروس کے رکن ہیں۔ اس پر انسپکٹر مطمئن ہو کر چلا گیا رات کو جب اندھیرا چھا گیا تو کھانا

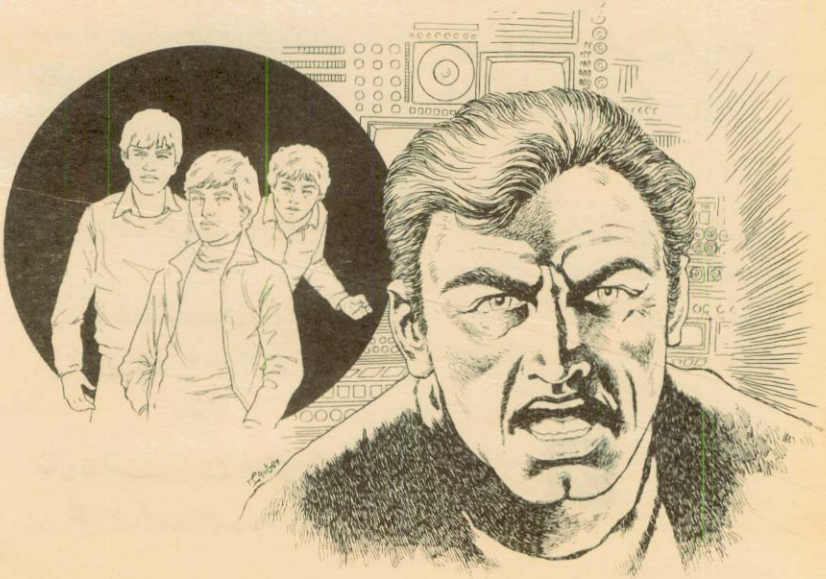

کھانے کے بعد ذیشان منصور اور صفدر سوٹ کیس لے کر باتھ روم میں گئے اور اپنے پاس پہلے سے موجود ماسٹر چابی کے ذریعے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ سوٹ کیس میں سونے کی اینٹیں اور ہیرے جگمگا رہے تھے۔ انہوں نے طے کیا کہ وہ لاہور پہنچ کر خالو کی مدد سے اس سوٹ کیس کی بابت پولیس کو بتائیں گے۔ لاہور پہنچنے کے بعد جب وہ اسٹیشن سے باہر آئے تو ایک ٹیکسی ان کے قریب آکر رکی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ میں آپ کو آپ کی منزل پر چھوڑ دوں گا۔ تشریف رکھیں۔ ذیشان، منصور اور صفدر ٹیکسی میں بیٹھ گئے، ٹیکسی چل دی۔ تھوڑی دیر بعد ٹیکسی جب شہر کو چھوڑ کر ویرانے کی طرف جانے لگی تو صفدر چلایا...... یہ کیا حرکت ہے؟ اس پر ڈرائیور نے اپنے چہرے پر سے سرکے ہوئے ہیٹ کو ہٹا کر انہیں دیکھا اور ان پر پستول تان لی...... تینوں سہم گئے۔ یہ تو وہی شخص تھا نیلے کوٹ والا۔ ٹیکسی چلتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد وہ ایک غیر آباد علاقے میں پہنچ چکے تھے۔ انہیں گھنی جھاڑیوں میں ہی ایک عمارت میں لے جایا گیا۔ اندر تاریک شیشوں کی عینک چڑھائے میگھاری نام کا ایک شخص انہیں ملا۔ یہ چیف باس کا نائب تھا۔ وہاں موجود غنڈے اور میگھاری ان تینوں کو کرنل رحمٰن کے حوالے سے اچھی طرح جانتا تھا۔ چنانچہ اس کے حکم سے تینوں کو ایک تنگ و تاریک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ مگر رات کو وہ کسی نہ کسی طرح اس عمارت سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ جب وہ اپنے خالو کے گھر پہنچے تو وہاں سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اندر سے آنے والی آوازیں میگھاری۔ دھاریوال اور ان کے خالو کی تھیں۔ دھاریوال کو اچانک ان کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔ مگر وہ اس کے آنے سے پہلے ہی گھر سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے سامنے جو دیکھا اس کی ان کو بالکل توقع نہ تھی۔

جمبو اور گیٹو ان کو گھر کے اندر لے گئے۔ وہاں ان پر انکشاف ہوا کہ صفدر کے خالو بھی ان بدمعاشوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ انہیں دیکھ کر صفدر کے خالو حاجی کمال بیگ نے ایک ٹرانس میٹر پر اپنے باس کو کرنل رحمان گروپ کے ارکان کے پکڑ لئے جانے کی اطلاع دی۔ تھوڑی دیر بعد میگھاری ان کو لے کر کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کے ساتھ تین اور غنڈے بھی تھے۔ مگر منصور نے چالاکی سے کام لیا اور تینوں لڑکوں نے ان بدمعاشوں پر قابو پالیا۔ پھر منصور نے ان کے ہیڈ کوارٹر کا پتہ معلوم کیا۔ اور ان کو اس طرف لے چلا۔ ابھی ان کے پیدل سفر کا آغاز ہوا ہی تھا کہ انہیں آواز آئی کہ "اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو"۔

یہ آواز حاجی کمال بیگ کی تھی جو اسٹین گن لئے ان کی طرف آرہا تھا۔ کمال کو دیکھ کر جمبو اور میگھاری کو بہت تعجب ہوا۔ اتنے میں انہوں نے دھاریوال کو زخمی حالت میں اپنی طرف آتے دیکھا۔ پھر وہ تینوں صفدر ذیشان اور منصور کو لے کر اپنے بگ باس کے پاس پہنچے۔ باس نے کمال کو ان تینوں لڑکوں کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔ کمرے میں پہنچ کر منصور نے منہ ڈھانپ کر کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص پر حملہ کیا مگر اس کے گرد شیشے کی دیوار سے ٹکرا کر زخمی ہو گیا۔ تبھی منصور اور کمال پر چھت سے پانی برسنے لگا۔ جس سے منصور ہوش میں آگیا اور کمال کا میک اپ اتر گیا۔ جس سے ظاہر ہوا کہ وہ کمال نہیں کرنل رحمٰن تھے۔ یہ دیکھ کر کے یہاں لڑکوں کو حیرت ہوئی۔ بگ باس یعنی ہاکسن ولیم کو یہ بات معلوم تھی کہ کرنل رحمٰن کمال کے بھیس میں یہاں پہنچ گئے ہیں۔ پھر ان تینوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرے میں تینوں لڑکوں نے کرنل رحمٰن سے ان تینوں تک پہنچنے کی تفصیلات پوچھیں۔ تھوڑی دیر بعد اصلی کمال پولیس سے رہا ہو کر وہاں آپہنچا اور باس کی ہدایت پر ان چاروں کو لے کر ہیڈ کوارٹر جا پہنچا۔ پھر لفٹ کے ذریعہ انہیں اس زمین دوز بستی میں لے جایا گیا جہاں انتہائی بڑی بڑی شخصیتیں اغواء ہونے کے بعد قید تھیں۔ ان سب کے نام بستی کی ایک اسکرین پر ان چاروں کے سامنے ظاہر ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نام دیکھ کر وہ سب چیخ اٹھے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

اسکرین پر کرنل نقوی کا نام روشن تھا۔ جب کہ اُن کی معلومات کے مطابق کرنل نقوی کو حکومت کے خلاف بغاوت کی سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کیا جا چکا تھا اور انتہائی سخت حفاظتی انتظامات میں رکھا گیا تھا۔

وہ پھٹی پھٹی نظروں سے اسکرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میگھاری کا قہقہہ انہیں ہوش کی دُنیا میں لے آیا۔ انہوں نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرے پر طنزیہ مُسکراہٹ تھی

"چیونٹی پہاڑ سے ٹکرانے نکلی تھی" میگھاری نے حقارت سے کہا۔ "تم صرف ایک نام پڑھ کر سکتے میں آگئے ہو۔ یہاں بہت سے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو دُنیا والوں کے لئے کب کے مر چکے ہیں۔ اُن لوگوں میں ملک دشمن بھی شامل ہیں۔ اور ملک دوست بھی۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہے؟" کرنل رحمان نے پوچھا جو کہ کافی حد تک خود کو سنبھال چکے تھے۔ کرنل نقوی جہاں قید ہے۔ وہاں تو انتہائی سخت حفاظتی انتظامات کئے گئے ہیں۔"

"دراصل قید کیا جانے والا شخص کرنل کی "ڈمی" ہے۔ اُسے پلاسٹک سرجری کے ذریعے کرنل نقوی بنایا گیا ہے۔ اصل کرنل یہاں بڑے ٹھاٹ سے رہ رہا ہے۔ ہم اپنے جانثار اور مخلص ساتھی کو جو ہمارے مفاد کی خاطر کام کرتے ہوئے گرفتار ہُوا تھا۔ مشکل میں اکیلا کیسے چھوڑ سکتے تھے؟" دھاریوال مُسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ مرنے والے لوگ جو کہ درحقیقت یہاں موجود ہیں، اُن کی بھی "ڈمیوں" کو قتل کیا گیا تھا؟" صفدر نے پوچھا۔

"ٹھیک سمجھے! ملک دوست افراد کو جنہیں ہم نے اغوا کر رکھا تھا پلاسٹک سرجری کے ذریعے ہمارے اُن ساتھیوں میں تبدیل کیا گیا جن کی حقیقت سے مختلف خُفیہ ادارے واقف ہو گئے تھے۔ پھر اُن افراد کی ڈمیوں کو قتل کر کے شہر کے مختلف مقامات پر پھینک دیا گیا اور اصل افراد یہاں پہنچا دیئے گئے۔ ڈمی افراد کی لاشیں جب برآمد ہوئیں تو ہمارے ساتھیوں کے خلاف ہونے والی تحقیقات خود بخود رُک گئیں۔ اس طرح ہمارے دوسرے کئی ساتھی بے نقاب ہونے سے بچ گئے۔ اگر تحقیقات جاری رہتیں تو یقیناً وہ بھی بے نقاب ہو جاتے۔" دھاریوال نے اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔

"اب اپنے کمروں میں چلو" میگھاری نے سخت لہجہ میں کہا اور وہ دھاری وال کے ساتھ ایک سمت میں چل پڑے۔ میگھاری وہیں کھڑا رہ گیا۔

کمروں تک پہنچا کر دھاریوال واپس چلا گیا۔

وہ چاروں خود کار دروازے سے پہلے کمرے میں داخل ہوئے۔ کمرہ انتہائی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ کمرے میں بیش قیمت فرنیچر پڑا ہُوا تھا۔ اس کمرے سے ساتھ والے کمرے میں جانے کے لئے ایک دروازہ موجود تھا۔ انہوں نے

بظاہر سرسری مگر گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ صفدر، منصور اور ذیشان کو کمرے میں کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ مگر کرنل رحمان کی عقابی نظروں سے کمرے میں موجود ویڈیو کیمرے اور مائیکروفون پوشیدہ نہ رہ سکے۔ حالانکہ انہیں بڑی مہارت سے وہاں چھپایا گیا تھا۔

بغلی دروازے سے وہ دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ یہ کمرہ بھی بڑی خوبصورتی سے سجا ہوا تھا۔ خفیہ ویڈیو کیمرے اور مائیکروفون یہاں بھی موجود تھے۔ جنہیں صفدر، منصور اور ذیشان نے بھی دیکھ لیا تھا۔

چاروں کمرے ایک قطار میں بنے ہوئے تھے۔ ہر کمرے میں ایک بغلی دروازہ تھا۔ جس کی مدد سے انہوں نے باقی کمرے بھی دیکھ لئے۔ تمام کمروں میں خفیہ ویڈیو کیمرے اور مائیکروفون موجود تھے۔ وہ دوبارہ پہلے کمرے میں پہنچے۔ اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔ اس قسم کی صورت حال کے متعلق وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اب وہ نہ گفتگو کے ذریعے کوئی منصوبہ بنا سکتے تھے اور نہ ہی کاغذ پر لکھ کر۔ کیونکہ ویڈیو کیمروں کے ذریعے اُن کی ہر حرکت نوٹ کی جا رہی تھی۔ بظاہر اُن کا فرار ہونا ناممکن نظر آتا تھا۔

"کرنل نقوی کے متعلق کون سوچ سکتا تھا کہ وہ یہاں موجود ہے۔" ذیشان کی آواز گونجی۔

"ابھی پتا نہیں اور کیا کیا انکشافات ہوں گے۔" صفدر بولا۔ اسی طرح وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

"کرنل رحمان!" کمرے میں موجود کسی پوشیدہ مائیک سے میگھاری کی آواز آئی اور وہ سب چونک اُٹھے۔ "تمہارے دل میں یقیناً خواہش ہوگی کہ اِس زمین دوز شہر کی سیر کروں۔ تمہاری یہ خواہش ابھی پُوری ہوگی۔ سیر اس لئے کروائی جا رہی ہے کہ تم شہر کے متعلق اچھی طرح جان لو۔ تمہاری باقی عمر یہیں گزرے گی۔ دھاریوال تمہیں سیر کروانے آ رہا ہے۔" آواز آنی بند ہوگئی۔ اور چند لمحوں بعد وہ سب کمرے سے باہر آ گئے۔ تقریباً تین منٹ بعد دھاریوال ایک سمت سے نمودار ہُوا اور وہ ایک طرف چل پڑے۔ جگہ جگہ ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ جن کی وجہ سے سارا شہر روشن نظر آ رہا تھا۔ چند منٹ چلنے کے بعد وہ ایک بازار میں پہنچ گئے۔ یہاں خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ لوگ چھوٹے چھوٹے ٹوکن دکانداروں کو دیتے اور چیزیں خرید رہے تھے۔ انہوں نے خریداری کر کے لوٹنے والے ایک شخص کو اشارہ کیا اور آگے بڑھے مگر دھاریوال نے اُنہیں روک دیا اور کہا۔ "اس شہر میں نئے آنے والوں سے برین واشنگ سے قبل کسی کو گفتگو کرنے کی اجازت نہیں۔ جو اس حکم کی خلاف کرتا ہے اُسے بجلی کی کُرسی پر بٹھا دیا جاتا ہے۔"

وہ پھر خاموشی سے چلنے لگے۔ دھاریوال آگے آگے چل رہا تھا۔

"کیا ہمیں یہاں آپس میں بھی گفتگو کرنے کی اجازت نہیں؟" اچانک صفدر نے سوال کیا۔

"آپ آپس میں گفتگو کر سکتے ہیں۔ باس کے آدمیوں کی موجودگی میں کیمروں سے باہر آپ کو گفتگو کرنے سے کوئی نہیں روکے گا۔" دھاریوال نے جواب دیا۔

وہ سمجھ گئے کہ کمروں سے باہر باس کے آدمیوں کی موجودگی کے بغیر گفتگو کرنے سے کیوں روکا جا رہا ہے۔ کمروں سے باہر اُن کی گفتگو سُننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے اور اس موقع پر یہاں سے فرار ہونے کے لئے کوئی بھی منصوبہ بنایا جا سکتا ہے۔

"یہ ٹوکن کیسے ہیں؟" منصور نے پوچھا۔

"اس زمین دوز شہر میں مختلف فیکٹریاں ہیں۔ جہاں آپ جیسے قیدی بنائے جانے والے افراد کام کرتے ہیں اور تنخواہ کے طور پر اُنہیں ٹوکن دیئے جاتے ہیں۔ ان ٹوکنوں سے ہر طرح کی خریداری ہو سکتی ہے۔ دھاریوال نے اُنھیں تفصیل سے بتایا۔

"کیا ہمیں یہ ٹوکن نہیں دیئے جائیں گے؟" ذیشان بولا۔

"اگر آپ نے فیکٹریوں میں کام کیا تو آپ کو ٹوکن ضرور ملیں گے۔ ورنہ نہیں۔ ٹوکن نہ ہونے کی صورت میں آپ کو کوئی بھی کھانے پینے کی چیزیں نہیں دے گا۔ اور آپ بھوک کی وجہ سے اذیت ناک موت سے دوچار ہوں گے۔۔۔" دھاریوال کا جواب سُن کر صفدر نے پوچھا۔

"فیکٹریوں میں بنتا کیا ہے؟"

"ہیروئن، دیگر منشیات اور جدید ترین اسلحہ" دھاریوال نے بتایا۔ اور اُن کی رگ و پے میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

"ہم ان فیکٹریوں میں کام نہیں کریں گے۔" منصور نے چلّا کر کہا۔ صفدر اور ذیشان نے بھی اُس کی تائید کی۔

"اگر فیکٹریوں میں کام نہیں کرو گے تو ٹوکن نہیں ملیں گے۔ اور ٹوکن نہ ہونے کی صورت میں خریداری ممکن نہیں۔ یہاں کوئی چیز چرائی بھی نہیں جا سکتی۔ بالفرض تم نے کھانے پینے کی کوئی چیز چُرا بھی لی تو وہ کب تک تمہارے کام آئے گی؟ یہ تو ایک امکانی بات تھی۔ عملاً ایسا ممکن نہیں۔ کیونکہ کام سے انکار کرنے والوں کو ایک تہہ خانے میں قید کر دیا جاتا ہے۔ وہاں قید ہونے والے یا تو کام کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یا پھر بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ کام سے انکار کرنے والوں میں سے صرف انتہائی اہم افراد کی برین واشنگ کی جاتی ہے اور اُنھیں باس کا وفادار بنایا جاتا ہے۔" دھاریوال سرد لہجہ میں بولا۔ اور اُن کے چہروں پر پژمردگی چھا گئی۔ اب وہ فیکٹریوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ دھاریوال نے ایک فیکٹری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ فیکٹری۔۔۔" اچانک تیز سائرنوں کی آواز گونجنے لگی اور اُس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ سائرنوں کی آواز مسلسل تیز ہو رہی تھی۔ اُنھیں یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اگر سائرنوں کی آواز یوں ہی تیز ہوتی رہی تو اُن کے کانوں کے پردے

پھٹ جائیں گے۔

"کوئی شخص کنٹرول روم میں داخل ہوگیا ہے۔ وہاں صرف کمپیوٹر ہیں"۔ دھاریوال چلّا کر بولا اور اُن کی طرف مُڑا پھر دھک سے رہ گیا۔ کیونکہ کرنل رحمان غائب تھے۔ دھاریوال اُن کے آگے آگے چل رہا تھا۔ اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ منصور، ذیشان اور صفدر کے چہرے کی طنزیہ مُسکراہٹ ظاہر کر رہی تھی کہ کنٹرول روم میں داخل ہونے والا کوئی اور نہیں کرنل رحمان ہیں۔ اچانک سائرن کی آواز بہت تیز ہوگئی اور ساتھ ہی ایک زور دار دھماکے کی آواز آئی۔ اُنھوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ دھاریوال گُم سُم کھڑا تھا۔ اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

آگے کیا ہُوا؟ آئندہ قسط میں لکھ بھیجئے۔

انجانی مہم کے سلسلے میں جن لکھنے والوں کی کہانیاں موصول ہوئیں اُن کے نام یہ ہیں

۱۔ حامد علی شاہد، ضلع چکوال
۲۔ توفیق سجاول، اسلام آباد
۳۔ آمنہ ہارون، گلشن حدید، کراچی
۴۔ کاشف عزیز، نارتھ ناظم آباد، کراچی
۵۔ عمر نواز ماہر، بنّوں
۶۔ محمد نوید مرزا، سوامی نگر، لاہور
۷۔ محمد رضوان مغل، نارتھ ناظم آباد کراچی
۸۔ خالد بلال، ایم۔ ٹی۔ خان، کراچی
۹۔ نعیم احمد ادیب، شاہ فیصل کالونی، کراچی

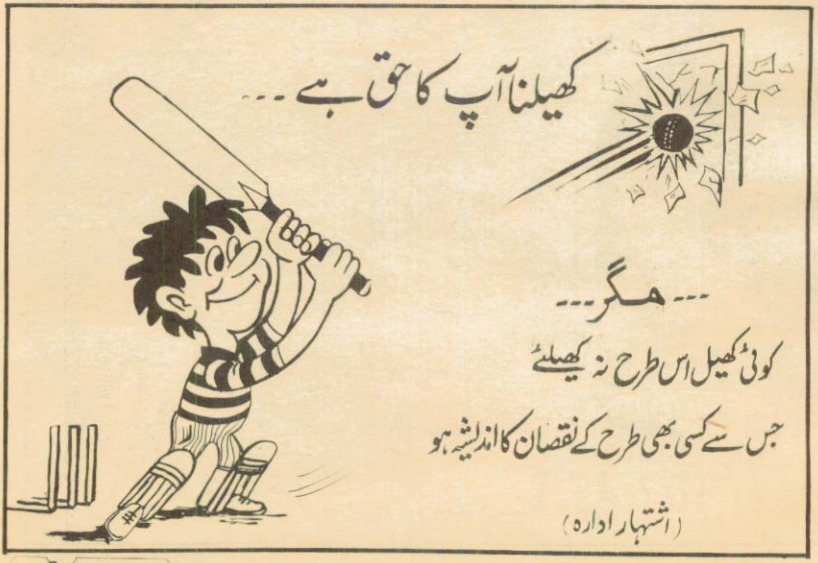

احسان کا بدلہ

احسان اللہ احمد

بہت پہلے کا ذکر ہے کہ اسلامی سلطنت کے صوبے افریقہ پر ایک بہت ہی بہادر اور شریف گورنر حکومت کرتا تھا۔ اس کا نام عبیداللہ بن حجاب تھا۔ ایک دن عبیداللہ بن حجاب اپنے دربار میں بیٹھے حکومت کے بڑے بڑے افسروں سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک ایسا نوجوان دربار میں آیا جس نے پھٹے پرانے کپڑے پہن رکھے تھے، لیکن اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ کسی بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔

گورنر عبیداللہ نے اس نوجوان کو دیکھا تو جلدی سے اٹھے اور نوجوان کو بہت عزت کے ساتھ اپنے پاس مسند پر بٹھایا۔ اس وقت دربار میں گورنر کے بیٹے موجود تھے۔ انہیں یہ بات بہت بری لگی کہ

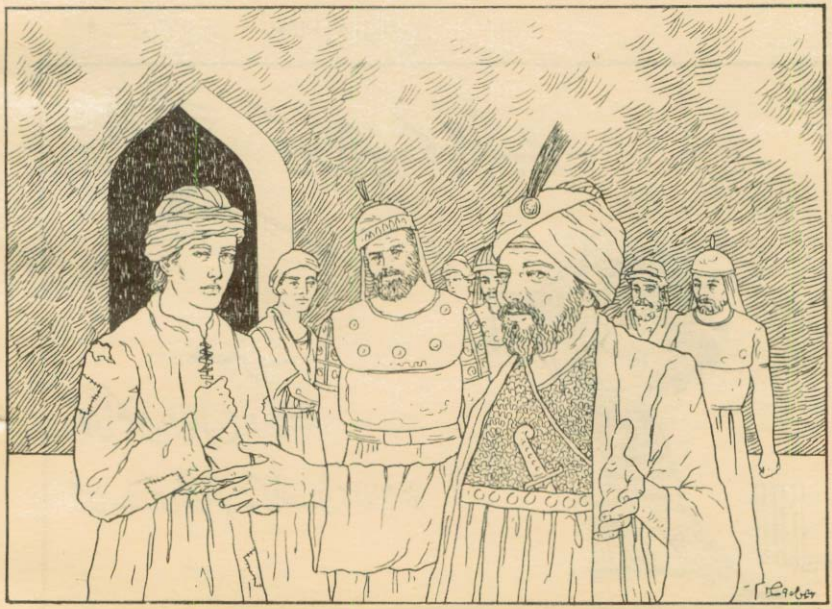

ہمارے والد صاحب نے ایک معمولی آدمی کو اپنے پاس اس طرح بٹھالیا ہے جیسے وہ کوئی بہت بڑا سردار ہے۔

بھرے دربار میں تو وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ لیکن جب عبیداللہ اپنے محل گئے تو ان کے بیٹوں نے دربار والی بات چھیڑی اور ان سے کہا۔ "آباجان، آج ہمیں اس بات سے بہت شرم آئی کہ آپ نے ایک غریب آدمی کا اس طرح استقبال کیا۔ جیسے وہ کہیں کا شہزادہ ہو۔ ہماری درخواست ہے کہ آئندہ آپ ایسا نہ کریں۔ آپ کو اپنے عہدے اور عزت کا خیال رکھنا چاہئے۔"

عبیداللہ بن حجاب نے بیٹوں کی بات پوری توجہ سے سنی اور پھر بولے "اے میرے بیٹوں، میں انشاء اللہ ایسا کروں گا کہ تمہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے گا۔"

اس کے دوسرے دن عبیداللہ بن حجاب نے شہر کے تمام امیروں اور حکومت کے عہدے داروں کو دربار میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور جب سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے تو وہ اس نوجوان کو ساتھ لئے ہوئے دربار میں آئے۔ انہوں نے اسے سب سے زیادہ عزت کی جگہ بٹھایا اور خود اس کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر سب درباری حیران ہوئے۔ گورنر کے بیٹوں کا حال تو دیکھنے کے قابل تھا وہ یوں شرمندہ ہو ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے ان کے باپ نے خاندان کی عزت خاک میں ملا دی ہو۔

ادھر عبیداللہ بن حجاب بھی اپنے بیٹوں کی حالت خوب سمجھ رہے تھے ذرا دیر بعد وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے بیٹوں کی جانب دیکھ کر بولے۔ "پیارے بیٹو! آج میں تمہیں تمہاری کل والی بات کا جواب دیتا ہوں کہ میں نے اس غریب نوجوان کی اس طرح عزت کیوں کی۔ سنو! اس نوجوان کا نام عقبہ ہے اور یہ اس خاندان سے ہے جو اس پورے علاقے پر حکومت کرتا تھا جس کا حاکم میں آج ہوں۔ یہ حجاج بن یوسف کا بیٹا ہے۔" درباریوں نے یہ سنا تو سب عقبہ کی طرف عقیدت بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ عبیداللہ کچھ دیر رک کر بولے "پیارے فرزندو! اب اس سے آگے کی بات سنو۔ جس زمانے میں حجاج بن یوسف کی قسمت کا ستارا چمک رہا تھا تمہارے، خاندان کی حالت بہت خراب تھی۔ تمہارے دادا حجاج کے غلام تھے۔ حجاج بن یوسف کو ان کی حالت پر رحم آگیا اور انہوں نے تمہارے دادا کو آزاد کر دیا۔ پھر آگے چل کر ایسا ہوا کہ حجاج کی قسمت کا ستارہ گردش میں آگیا۔ اس کے خاندان کی عزت اور شان و شوکت ختم ہو گئی اور خدا نے ہماری عزت کو عزت اور حکومت میں بدل

دیا۔ لیکن بیٹو! میں یہ بات کبھی نہیں بھول سکتا کہ حجاج نے میرے والد پر احسان کیا تھا۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں اپنے محسن کے بیٹے کی عزت کیوں نہ کرتا اور اسے عزت سے اپنے پاس کیوں نہ بٹھاتا؟"

عبیداللہ کی یہ بات سن کر پورے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ خاص طور پر ان کے بیٹے تو حیرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے شرمندہ ہو کر سر جھکا لئے تھے۔ عبیداللہ بن حجاب ذرا دیر رک کر بولے "بیٹو! ہمارے آقا اور اللہ کے سچے رسول حضرت محمدؐ کا ارشاد ہے "جو شخص اپنے خاندان کو معمولی سمجھ کر کسی اور خاندان سے رشتہ جوڑتا ہے اور جو شخص اپنے محسن کے احسان کو بھلا دیتا ہے۔ وہ بہت برا ہے۔" بیٹو! آج میں نے بھرے دربار میں..... میں یہ بات بتائی ہے کہ تم اپنے خاندان کے محسن کو اچھی طرح پہچان لو، اور ساتھ ہی تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تمہارے خاندان کی ہمیشہ سے ایسی ہی شان و شوکت نہ تھی۔ تمہیں چاہئے کہ ان دونوں باتوں پر غور کرو اور برے لوگوں میں شامل ہونے سے بچ جاؤ۔"

یہ باتیں بتانے کے بعد عبیداللہ بن حجاب نے عقبہ سے کہا "اے جوان! خدا نے اس وقت تجھے ایسا اختیار دیا ہے کہ میں تیری ہر خواہش پوری کر سکتا ہوں تو مجھے بتا کہ میں تیری کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

نوجوان نے پہلے تو عبیداللہ کے اس اچھے سلوک کا شکریہ ادا کیا اور پھر کہا "حضرت! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کوئی عہدہ دے کر اندلس بھیج دیں۔ میں اپنی باقی زندگی وہیں گزارنا چاہتا ہوں۔"

اس زمانے میں مسلمانوں کی سلطنت اتنی بڑی تھی کہ یورپ کا یہ ملک، جسے عرب اندلس کہتے تھے اور جسے اب اسپین کہا جاتا ہے، اس سلطنت میں شامل تھا۔ گورنر عبیداللہ نے عقبہ کو ایک بڑا عہدہ دے کر اسی دن اندلس بھجوا دیا۔

اس واقعے کو ہزار سال سے زیادہ گزر چکے ہیں لیکن عبیداللہ بن حجاب کی شرافت اور احسان مندی کی بات آج بھی زندہ ہے اور قیامت تک زندہ رہے گی۔ سب ان کا ذکر عزت سے کریں گے۔

استاد نے جماعت میں اردو کا سبق پڑھا کر اس کی مشقیں کرنے کو دیں۔ مشقوں میں ایک سوال نئے الفاظ کو جملوں میں استعمال کرنے کا تھا۔ اور ان نئے الفاظ میں ایک لفظ "کار گزاری" بھی تھا۔ دوسرے روز استاد نے کاپیاں دیکھیں تو ایک طالب علم نے اس لفظ کو جملے میں اس طرح استعمال کیا تھا۔ "کار کے مالک نے پل پر سے کار گزاری"۔ محمد عثمان طارق..... حیدر آباد

قسط نمبر ۶

ڈاڑیل

نعیم بلوچ

اٹھارہ سالہ جانو کو اپنی بیمار ماں کے علاج کے لئے وڈیرے سے رقم نہ مل سکی۔ گوٹھ کے ایک ہندو بیوپاری رام چند نے اس کو ماں کے علاج کے لئے رقم بھی دی اور اسے ملازمت دلانے کے لئے اپنی اوطاق پر بلایا جانو جب وہاں پہنچا تو اس نے تین افراد اور اپنے ہم عمر لڑکے منظور کو پہلے سے موجود پایا۔ تھوڑی دیر بعد جانو اور منظور کی آنکھ پر پٹی باندھ کر ایک جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد جیپ کسی نامعلوم جگہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ انھیں اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ ڈاکوؤں کے کسی گروہ میں شامل ہو چکے ہیں۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ ایک پہاڑی غار میں پہنچا دیئے گئے۔ یہاں انھیں ڈکیتی کے لئے تیار ہونا پڑا۔ چند روز بعد انھوں نے رات کے تین بجے مرکزی شاہراہ پر مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس کو رکاوٹیں کھڑی کر کے روک لیا۔ بس میں موجود پولیس کے دو مسلح سپاہی اور مسافر چونک پڑے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکوؤں نے بس کے تمام مسافروں کا اسباب لوٹ لیا اور ایک بوڑھے ہاری کو گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ جانو کو مسافروں سے ہمدردی اور ڈاکوؤں سے نفرت ہونے لگی تھی۔ وہ اپنے آپ کو ڈاکو نہیں سمجھ رہا تھا۔ دوسری طرف رام چند نے ارد گرد کے علاقے میں رہنے والوں کو دعوت پر بلایا اور ملک کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا کہ جو حکمران بھی آتا ہے وہ سندھیوں کو مارتا ہے۔ اس کے بعد رام چند۔ زندہ باد اور "سندھو دیش۔ زندہ باد" کے نعرے بھی لگے۔ دعوت کے بعد رام چند سردار قادر خان کو ایک خفیہ کمرے میں لے گیا جہاں بے شمار اسلحہ موجود تھا۔ رام چند نے قادر خان کو کہا کہ وہ ہر اس آدمی کو اغوا کر لے یا گولی مار دے جو فوج کو کسی بھی ڈاکو کے بارے میں کچھ

بتائے۔ پھر اس نے قادر خان کو کہلوہ مشہور پاکستان دوست لیڈر عبدالحق کو ہر قیمت پر اغواء کر لے۔ ادھر جانو کی ماں کو جب علم ہوا کہ اس بیٹا ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو چکا ہے تو وہ یہ صدمہ برداشت نہ کر سکی اور مر گئی۔ دوسری طرف ایک روز رات کے وقت عبدالحق اپنی کار میں گھر آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ ایک صحافی بھی تھا۔ جو ان کا انٹرویو کرنا چاہ رہا تھا۔ اچانک ایک سیاہ شیراڈ نے ان کی گاڑی کا راستہ روک لیا۔ ڈرائیور اور صحافی کو بے ہوش کر کے عبدالحق کو بھی بے ہوش کر کے شیراڈ میں بٹھالیا گیا۔ اور اسے ڈاکو قادر خان کے ٹھکانے پر لے گئے۔ ۲۵ تاریخ کو رام چند نے اخبار میں عبدالحق کے اغواء کی خبر پڑھی اور وائرلیس پر کسی کو اس کامیابی کی اطلاع دی۔ چند روز بعد قادر خان کی جیپ عبدالحق۔ جانو اور رام چند کے ایک آدمی کو لے کر کسی اجنبی مقام کی طرف جا رہی تھی۔ عبدالحق جانو کو غور سے دیکھتا رہا۔ جب ان کی جیپ اپنی منزل پر پہنچی تو عبدالحق جانو کو پہچان چکا تھا۔ جانو کو معلوم ہو گیا کہ عبدالحق اس کے باپ کو جانتا ہے۔ اس نے عبدالحق کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز ڈاکو قادر خان کے آدمیوں نے گاؤں میں زبردست فائرنگ کی اور مختلف مکانات کو آگ لگا دی۔ گاؤں کے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر نکل بھاگے۔ اگلے دن وہ اپنی بہنوں سے ملنے گیا اور ان کے سامنے عہد کیا کہ وہ ڈاکو نہیں بنے گا۔ اس نے انہیں انتظار کرتے کو کہا تاکہ وہ لوگ گاؤں چھوڑ کر کسی اور جگہ جا سکیں۔ پھر وہ اس حویلی میں جا پہنچا جہاں عبدالحق کو قید میں رکھا گیا تھا۔ اندھیرے میں اس کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس سے کافی آواز پیدا ہوئی۔ اتنے میں کسی نے جانو کو للکارا۔

جانو جانی، پہچانی آواز کو سن کر گھبراتا ہوا اس کمرے کے پاس پہنچا جس میں، رام چند اور اس کے ساتھی، عبدالحق اور دیگر بڑے بڑے لیڈروں کے اغوا اور قتل کے منصوبے بنا رہے تھے۔ اچانک جانو کو پیچھے سے ایک شخص نے پکارا۔ یہ منظور تھا۔ منظور کے ذریعے جانو عبدالحق کے تہہ خانے تک پہنچا اور پھر عبدالحق کو لے کر فرار ہو گیا مگر فرار ہوتے ہوئے ان دونوں کو دیکھ لیا گیا۔ اور کچھ لوگ ان دونوں کے تعاقب میں روانہ ہو گئے۔ جانو نے حویلی سے بہت دور ستائے ہوئے عبدالحق سے اپنے باپ کے قاتل کے بارے میں پوچھا مگر عبدالحق نے کوئی جواب نہ دیا۔ ادھر جانو کے بہن بھائی گھر پر اس کے منتظر تھے۔ اتنے میں رام چند ان کے گھر پہنچا۔ تو اسے اس کی بیوی نے بتایا کہ جانو نے گھر آ کر اس سے بدتمیزی کی ہے۔ رام چند اپنے کمرے میں تھا کہ جانو آ کر اپنے بہن بھائیوں کو وہاں سے نکال کر لے گیا۔ رام چند نے تھوڑی دیر بعد جانو کے بہن بھائیوں کو ان کے کمرے میں نہ پایا تو اس نے اپنے آدمیوں کو والی ملکی پر ان کو تلاش کرنے کا حکم دیا۔ جانو اپنے بہن بھائیوں کو گندم کے ایک کھیت میں چھپا کر ان کے لئے پانی لینے گیا۔ واپس آیا تو اس کے بھائی بہن وہاں موجود نہ تھے۔ اتنے میں اسے ایک مانوس آواز نے پکارا جانو نے گھوم کر آواز کی طرف دیکھا۔

اب آپ آگے پڑھئے.....

"بچے پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں؟ میں اُنہیں یہیں چھوڑ کر گیا تھا" ننھی حمیدہ کے لئے پانی لینے" جانو نے سخت گھبرائی ہوئی آواز میں عبدالحق سے کہا۔ عبدالحق نے سوچتے ہوئے سر ہلایا اور پھر وہ تیزی سے اُس جگہ کی طرف چل دیا جہاں وہ جانو اور اس کے بھائی بہنوں کو چھوڑ کر گیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے جب اِرد گرد کے پودوں کو غور سے دیکھا تو اُسے ایک طرف کے پودے زمین پر گرے ہوئے نظر آئے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہاں سے کچھ آدمی اِن پودوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اُن کو پاؤں کے نیچے مَل کر گزرے ہیں۔ عبدالحق نے جانو کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ خود وہ گرے ہوئے پودوں سے بنے ہوئے راستے پر چلنے لگا۔ کھیت سے باہر آ کر عبدالحق زمین پر بیٹھ گیا اور غور سے پاؤں کے نشانات دیکھنے لگا۔ روشنی ابھی زیادہ نہیں تھی اس لئے اُسے خاصی دقّت محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ بچّوں کے ساتھ ایک بڑے آدمی کے

پاؤں کے نشان دیکھنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ پاؤں کے نشانات قریب کے گاؤں کی طرف جاتے تھے۔ دونوں سمجھ چکے تھے کہ بچے کسی آدمی کے ساتھ قریب کے گاؤں چلے گئے ہیں۔ عبدالحق نے جانو کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔

"اگر ہم اس وقت بچوں کو تلاش کرنے میں مصروف ہوگئے تو پھر کبھی زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ ہوسکتا ہے بچے کسی محفوظ ہاتھوں میں پہنچ چکے ہوں۔ آؤ ہمیں جلد از جلد پولیس اسٹیشن پہنچ جانا چاہئے۔ کسی وقت بھی نئی مصیبت سے دوچار ہوسکتے ہیں۔"

جانو جانتا تھا کہ عبدالحق کی بات بالکل صحیح ہے، لیکن پھر بھی وہ اپنے بہن بھائیوں کو یوں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ اپنی خواہش کے بالکل خلاف عبدالحق کے ساتھ چل پڑا۔

وڈیرہ رسول بخش دل ہی دل میں رام چند کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ آج اتنی صبح اُسے ملنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی۔ لیکن جب ڈرائنگ روم میں اُس نے رام چند کو سخت گھبرائے ہوئے دیکھا تو سمجھ گیا کہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ رام چند اُسے دیکھتے ہی بول پڑا۔ اُس نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔

"اِس میں گھبرانے کی کیا بات ہے رام چند! وہ اتنی جلدی شہر تو پہنچ سکتے نہیں۔ ضرور کسی جگہ چھپے ہوئے ہوں گے۔ میں اپنے تمام مزارعوں سے کہتا ہوں کہ وہ ان کو ڈھونڈ نکالیں۔" وڈیرے نے بے فکری سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے سائیں لیکن میرے خیال میں وہ پولیس تھانے میں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ اگر وہ نصیر آباد کے تھانے پہنچ گئے تو عبدالحق وہاں سے ٹیلی فون کرکے شہر سے رابطہ قائم کرسکتا ہے۔ اس لئے میں یہ کہتا ہوں کہ آپ ذرا اس کے تھانے دار سے بات کرلیں۔" رام چند نے ڈرے ڈرے سے انداز سے کہا۔

"عبدالحق کا اغوا پورے ملک میں مشہور ہوچکا ہے۔ اس کے بارے میں پولیس کو کسی کارروائی سے روکنا بہت خطرناک ہے۔ یہ سائیں تمہارا مسئلہ ہے۔ ہاں میں جانو کے بارے میں ضرور تھانیدار کو کہہ سکتا ہوں۔"

"نہ سائیں نہ... ایسا نہ کہو کہ عبدالحق کا تمہارے ساتھ تعلق نہیں ہے۔ تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ عبدالحق جانو کے باپ وسایا کو جانتا تھا۔ اس لئے تو اُس نے جانو کو ورغلایا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُسے وسایا کے قتل کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور معلوم ہے اور تم یہ خیال دل سے نکال دو کہ عبدالحق سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ عبدالحق کو ڈاکو قادر خاں نے اغوا کروایا تھا۔ اس لئے جب قادر خاں گرفتار ہوگا تو میرے ساتھ تم بھی نہیں بچ سکو گے۔ یہ بات تو پولیس والے بھی جانتے ہیں کہ قادر خان تمہارا آدمی ہے۔"

وڈیرے کے چہرے پر پہلی دفعہ پریشانی کے آثار دکھائی دیئے تھے۔ اُس نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ اُسے

بھی پولیس سے کوئی خطرہ ہو سکتا ہے۔

"پھر تم ہی بتاؤ کیا کرنا ہے؟" اُس نے رام چند سے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"دیکھو سائیں! یہ صرف تمہارا یا میرا معاملہ نہیں ہے۔ یہ سندھو دیش کا معاملہ ہے۔ میں نے عبدالحق کو اپنے فائدے کے لئے اغوا نہیں کیا تھا۔ اس لئے عبدالحق زندہ سلامت شہر پہنچ گیا تو یہ بہت خطرناک ہوگا۔ اس لئے تمہیں آج اپنی پوری طاقت استعمال کرنا ہوگی۔ ہمیں اس وقت نصیر آباد کے تھانے میں خود جا کر تھانیدار سے بات کرنا ہوگی۔" رام چند نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کیا قادر خاں کو یہ ساری باتیں معلوم ہیں؟" وڈیرے نے ایک دم سوال کیا۔

"ہاں۔ میں نے اُس کی طرف بھی آدمی بھجوا دیا ہے۔ لیکن تم قادر خاں کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"اس لئے کہ میرے خیال میں ہمیں یہ معاملہ قادر خاں کے سپرد کر دینا چاہئے۔ اگر وہ اُنہیں پولیس تک پہنچنے سے نہ روک سکا تو پھر دیکھا جائے گا۔"

"سائیں تمہیں عبدالحق کی طاقت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بڑے بڑے افسروں سے تعلقات ہیں۔ ایک دفعہ وہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر بہت مشکل ہو جائے گی۔ یہ نہ ہو کہ ہم اس انتظار میں رہیں کہ وہ پولیس تک پہنچتا ہے یا نہیں اور دوسری طرف پولیس ہم کو گرفتار کرنے آجائے۔!"

"رام چند آخر بنیا ہونا۔! ڈر کے مارے تمہاری جان نکل رہی ہے۔ چلو جیسا تم کہو گے ویسا ہی ہوگا۔" وڈیرے نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

جانو اور عبدالحق جب نصیر آباد کے تھانے پہنچے تو اُن کو بڑی عزت سے بٹھایا گیا۔ جانو نے عبدالحق کے کہنے کے مطابق تھانیدار کو صرف اپنے بہنوں اور بھائی کے متعلق بتایا۔ اُس کے بعد وہ خاموش ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پولیس والے اس کی اتنی عزت کریں گے اور اس سے اتنی ہمدردی سے پیش آئیں گے۔ لیکن اُسے معلوم نہیں تھا کہ عبدالحق جب انہیں کھیت میں چھوڑ کر اکیلا تھانے آیا تھا تو تھانیدار نے کتنی مشکل سے اُسے اپنے کمرے میں گھسنے کی اجازت دی تھی۔ لیکن جب اُس نے کہا کہ وہ آئی جی سے فون پر بات کرنا چاہتا ہے تو تھانیدار نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا تھا۔ اُس وقت عبدالحق نے اُسے بتایا تھا کہ وہی مشہور پاکستان دوست دانشور ہے جس کی تصویر اس کے تھانے میں بھی بھیجی گئی ہوگی۔ تھانیدار نے اس کی تصدیق کرنے کے بعد اُسے فون کرنے کی اجازت دے دی تھی لیکن اُسے اس بات کی بالکل توقع نہ تھی کہ عبدالحق واقعی آئی۔ جی کو فون کرے گا۔ اور آئی جی اُسے حکم دے گا کہ اگر اُس نے

عبدالحق کی مدد کرنے میں کوئی کوتاہی کی تو وہ نہ صرف ملازمت سے نکال دیا جائے گا بلکہ اُسے گرفتار بھی کر لیا جائے گا۔

کچھ دیر بعد جانو اور عبدالحق کے لئے ناشتا لایا گیا۔ چائے پیتے ہوئے عبدالحق نے تھانیدار سے کہا۔

"انسپکٹر صاحب! کیا آپ کو معلوم ہے کہ آج سے دس سال پہلے بھی ہم اس تھانے میں ایک دوسرے سے مل چکے ہیں؟"

"نن نہیں... مجھے تو بالکل یاد نہیں" تھانیدار نے جواب دیا۔

"چلئے میں آپ کو یاد دلائے دیتا ہوں۔ میں آپ کو ایک ملزم کے کاغذات دکھانے آیا تھا۔ آپ نے اُس ملزم کو پوری کے الزام میں حوالات میں بند رکھا تھا۔ جب آپ میرے لائے ہوئے کاغذات دیکھ رہے تھے تو ایک کانسٹیبل ایک آدمی کو گریبان سے پکڑ کر آپ کے کمرے میں لایا تھا۔ کانسٹیبل نے اُس آدمی کو گالیاں دیتے ہوئے کہا کہ وہ آپ کے سامنے بات کرے۔ اُس نے وڈیرے رسول بخش کے متعلق کہا تھا کہ اُس نے ڈاکو قادر خاں کو کہا تھا کہ وہ اُن تمام مزارعوں کے کھیت جلا دے جو اپنے بچوں کو اسکول سے ہٹانے پر تیار نہیں ہیں۔"

"نہ سائیں... مجھے تو بالکل یاد نہیں۔ یہاں تو ہر روز کئی لوگ آتے ہیں، اب میں ہر کسی کو کیسے یاد رکھتا پھروں۔ آپ تو دس سال پہلے کی بات کر رہے ہیں، مجھے تو صبح کو دیکھے آدمی شام کو بھول جاتے ہیں" تھانیدار نے اپنی لمبی مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ عبدالحق بڑے غور سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تھانیدار کے لہجے میں مصنوعی پن صاف دیکھ رہا تھا۔ چائے کے دو تین گھونٹ پینے کے بعد اُس نے تھانیدار سے ایک اور سوال کیا۔

"اچھا آپ کو وڈیرے رسول بخش کا ہاری وسایا، تو یاد ہو گا ہی۔ اُسے قتل کر دیا گیا تھا۔ اُس کا کیس تو آپ نے درج کیا ہی ہو گا نا" عبدالحق نے دیکھا کہ تھانیدار کا ہاتھ مونچھوں کو تاؤ دیتا دیتا رُک گیا تھا۔ اُس کی نظریں جانو پر ٹکی تھیں۔ وہ شاید پہلی دفعہ اُسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ جانو بھی اپنے باپ کا نام سُن کر کھانا پینا بھول گیا تھا۔ وہ خونخوار نظروں سے تھانیدار کو دیکھ رہا تھا۔ تھانیدار اُس کی عقابی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ وہ دوبارہ عبدالحق کو دیکھنے لگا۔ جو اُسے جوالہ طلب نظروں سے گھور رہا تھا۔

"وسایا تو جناب ڈاکوؤں کے ساتھ..." اُس کے الفاظ اُس کے منہ میں تھے کہ کمرے میں وڈیرہ رسول بخش اور رام چند داخل ہوئے۔ وہ اُنہیں دیکھ کر اپنی کرسی سے فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانو اور عبدالحق کو دیکھ کر رام چند اور وڈیرے کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ وڈیرے نے جانو کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور تھانیدار پر برس پڑا۔

"تم نے اس کمی کمین کو ہمارے برابر لا بٹھایا ہے۔ باہر نکالو اسے"

"یہ تمہاری حویلی نہیں ہے۔ جو مجھے یوں باہر نکلوا رہے ہو" جانو نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"تمہاری یہ مجال، نمک حرام" وہ جانو کی طرف بڑھا۔

"ٹھہریئے سائیں بابا۔ تھانے میں آپ اُسے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ آیئے آپ میرے ساتھ آیئے" تھانیدار جلدی سے اُٹھتا ہُوا بولا۔

"اوہ۔ تو تم بک چکے ہو۔ یاد رکھو۔ اگر تم نے ان میں سے کسی کی کوئی مدد کی، نہ تم زندہ بچ سکو گے نہ تمہارے بچّے" تھانیدار نے اُسے دھمکی دی۔

"انسپکٹر... تم اسے گرفتار کیوں نہیں کرتے ... یہ تمہیں پولیس اسٹیشن آکر دھمکیاں دے رہا ہے اور تم اُس کے سامنے بھیگی بلّی بنے بیٹھے ہو۔ اس شخص کو بھی گرفتار کرو۔ اس نے مجھے غیر قانونی طور پر قید میں رکھا تھا" عبدالحق نے رام چند کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ شہر نہیں ہے سائیں۔ یہاں وہی کچھ ہوتا ہے جو ہم چاہتے ہیں۔ تم جتنے مرضی ٹیلی فون کر کے افسروں سے سفارش کروالو، لیکن یہ تھانیدار جانتا ہے کہ اگر اس نے ہمارے خلاف کوئی بات کی تو شہر سے مدد آنے سے پہلے پہلے اس کی تکا بوٹی ہو چکی ہوگی" رام چند نے تھانیدار اور عبدالحق کو ایک ساتھ دھمکی دی۔ پھر اُس نے وڈیرے سے کہا "چلو سائیں ہم بھی کسی کو ٹیلی فون کرتے ہیں۔ دیکھتے ہیں اس ملیچھ "محبِ وطن" کی فتح ہوتی ہے یا ہماری"

دونوں کمرے سے باہر آگئے۔ وڈیرے نے گھبرائے ہوئے لہجے سے کہا "میرا خیال ہے، تھانیدار، پولیس کی جیپ میں عبدالحق اور جانو کو شہر بھیج دے گا۔ اس کے بعد ہمارا بچنا بڑا مشکل ہو جائے گا"

"فکر کیوں کرتے ہو سائیں۔ اگر انہوں نے شہر جانا ہوتا تو وہ کبھی کے جا چکے ہوتے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ جانو اکیلا تھا۔ اس کی بہنیں اور بھائی اس کے ساتھ نہیں تھے۔ میرے خیال میں وہ اس سے بچھڑ گئے ہیں۔ جب تک وہ انہیں مل نہیں جاتے یہ شہر نہیں جا سکیں گے۔ اگر ہم کسی طرح بچوں کو تلاش کر لیتے ہیں تو پھر کم از کم جانو تو ہمارے قابو میں آ ہی جائے گا" رام چند نے وڈیرے کو تسلّی دی۔

جانو کی بہنیں اور بھائی ایک ہاری کے گھر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ یہ ہاری صبح صبح اپنے کھیتوں کو پانی دینے جا رہا تھا جب وہ اس کھیت کے قریب سے گزرا تو اُسے ننھی حمیدہ کے رونے کی آواز آئی۔ وہ تین بچوں کو وہاں دیکھ کر بہت حیران ہُوا۔ کوئی بھی بچہ اُسے صحیح طرح سے یہ نہیں بتا رہا تھا کہ وہ یہاں کیا کر رہے ہیں۔ ہاری کو خطرہ تھا کہ کوئی نہ کوئی جنگلی سور اِدھر آجائے گا اور بچوں کو زخمی کر جائے گا۔ لیکن جب اُس نے اُنہیں اپنے ساتھ آنے کو کہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر ہاری اُنہیں اس طرح چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ اتنی دیر میں اُنہیں کسی کے دوڑ کر گزرنے کی آواز آئی۔ ہاری خوب پہچانتا تھا کہ یہ جنگلی سؤر ہیں

جب اُس نے بچّوں کو بتایا کہ یہ جنگلی سؤر ہیں تو وہ ڈر کر اُس کے ساتھ ہو لئے۔ راستے میں ہاری کو بچّوں نے سب کچھ بتا دیا۔ ہاری اُن سے بڑی محبّت سے پیش آیا۔ اُنہیں کھانا کھلا کر وہ سیدھا اپنی مسجد کے مولوی صاحب کے پاس گیا۔

"میرے خیال میں مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کر دیا جائے۔ ہو سکتا ہے ان بچّوں کا بھائی جانو اُنہیں اس گاؤں میں تلاش کر رہا ہو۔" مولوی صاحب نے ہاری سے کہا۔

"لیکن مولوی صاحب! اگر رام چند نے اعلان سُن لیا تو؟" ہاری نے فکرمندی سے کہا۔

"بے وقوف ہو تم بھی، بھلا رام چند اِدھر اس گاؤں میں کہاں آجائے گا۔ اور پھر ہم ان بچّوں کو ایرے غیرے کے ہاتھ تھوڑا ہی دے دیں گے۔ ان کے بھائی کے حوالے ہی تو کریں گے۔" مولوی صاحب کی بات ہی معقول سمجھی گئی۔

رام چند اور وڈیرہ رسول بخش پولیس اسٹیشن سے واپس آرہے تھے جب انہوں نے مسجد سے اعلان سُنا۔

حضرات! ایک ضروری اعلان سُنیں۔ جانو نام کے ایک لڑکے کی چھوٹی بہنیں اور بھائی رمضان، شامو ہاری کے گھر موجود ہیں۔ جانو یا اس کا جاننے والا اگر یہ اعلان سُن رہا ہو تو وہ جامع مسجد کھجور والی میں آکر مولوی صاحب سے رابطہ کرے۔ "شُکریہ"

یہ اعلان سُن کر رام چند اور وڈیرے کی باچھیں کھل گئیں۔ رام چند نے وڈیرے سے کہا۔

"لیجئے سائیں، ایک کام تو ہُوا۔ آپ اس سانپ کے بچّوں کو لے کر اپنی گوٹھ میں آجائیے۔ میرا نام سُن کر ہو سکتا ہے کہ آپ کے مولوی صاحب ناراض ہو جائیں۔ میں آپ کی حویلی میں آپ کا انتظار کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے آپ کے آنے تک قادر خاں بھی وہاں پہنچ جائے۔ پھر دیکھوں گا کہ یہ ملیچھ عبدالحق کیسے پہنچتا ہے شہر!"

وڈیرے نے رام چند کی بات مانی اور مسجد کی طرف ہو لیا۔

"سائیں رسول بخش آپ؟ کیسے تشریف لائے؟" جونہی وڈیرہ مسجد میں داخل ہُوا، مولوی صاحب نے بھاگ کر اُن کا استقبال کیا۔ وہ وڈیرے کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ پچھلے سال وڈیرے کی بیٹی کا نکاح اُسی نے پڑھایا تھا۔

"مولوی صاحب یہ تو میری گوٹھ کے مزارعے وسایا کے بچّے ہیں۔ آپ کو کیسے ملے؟ انہیں میرے ساتھ بھیج دیں۔ میں انہیں گھر پہنچا دوں گا۔" مولوی صاحب وڈیرے کی رحم دلی اور غریب نوازی کی تعریفیں کرنے لگے۔ شامو ہاری نے وڈیرے کو بتایا کہ اُسے یہ بچّے کیسے ملے۔ وڈیرے نے شامو ہاری کی رحم دلی کی تعریف کی اور کہا کہ وہ بچّوں کو جلدی سے لے آئے۔ شامو بچّوں کو لینے اپنے گھر چلا گیا۔

گاؤں میں پولیس کے دو سپاہی بھی اس اعلان کو سُن چکے تھے۔ اُن دونوں کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ وہ جانو کے

بھائی بہنوں کا کھوج لگائیں۔ شامو کے جانے کے بعد وہ دونوں بھی پہنچ گئے۔ پولیس کو دیکھ کر وڈیرے کا ماتھا ٹھنکا۔

"مولوی صاحب بچّوں کو ہمارے ساتھ بھیج دیں۔ ان کا بھائی تھانے میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔"

"لیکن وہ تو سائیں رسول بخش کے ساتھ جا رہے ہیں اور ان کا بھائی تھانے میں کیا کر رہا ہے" مولوی صاحب نے حیرت سے پوچھا

وڈیرے نے کام بگڑتا ہُوا دیکھ کر فوراً مداخلت کی:... مولوی صاحب! میں نے تو سمجھا تھا کہ بے چارے جانو کا پردہ رہ جائے گا۔ وہ دراصل جانو ڈاکوؤں کے ساتھ مِلا ہُوا ہے نا! رات کو پولیس نے چھاپا مارا تو وہ ان بچّوں کو لے کر بھاگ گیا۔ میرے خیال میں بچّوں کو وہ کھیت میں چھُپا کر کوئی ٹھکانا تلاش کرنے گیا ہو گا تو پکڑا گیا ہو گا۔" پھر وہ پولیس سپاہیوں کی طرف متوجّہ ہُوا "تم بہت ذمّے دار ہو۔ میں تھانیدار سے سفارش کروں گا کہ تمہاری ترقّی کر دے۔" اور پھر اُس نے اپنی دائیں آنکھ دبا دی۔ "میں بچّوں کو اُن کے گھر پہنچا دوں گا۔ ایسے ہی تھانے میں جا کر ڈریں گے۔" یہ کہہ کر اُس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ سو سو روپے کے دو نوٹ نکالے اور اُن دونوں کی طرف بڑھا دیئے۔ پولیس سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر سو سو روپے کے نوٹ پکڑ لئے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ایک دو سو روپے کی رشوت کتنا فساد برپا کر سکتی ہے۔ انہوں نے وڈیرے کو سلام کیا اور پولیس اسٹیشن یہ اطلاع دینے روانہ ہو گئے کہ گاؤں میں بچّوں کا کوئی سُراغ نہیں ملا۔ تھوڑی دیر بعد شامو بچّوں کو لے کر مسجد آ گیا۔ بچّوں نے جب یہ سُنا کہ... جانو اُس کی حویلی میں اُن کا انتظار کر رہا ہے تو وڈیرے کے ساتھ جانے پر راضی ہو گئے۔

(باقی آئندہ)

آنکھ مچولی ایک سال تک مُفت حاصل کیجیے

اک ذرا سی زحمت سے آنکھ مچولی کے دو سالانہ خریدار بنائیے اور خود سال بھر تک ہر ماہ آنکھ مچولی مفت حاصل کیجیے۔ آنکھ مچولی رسالۂ ادب بھی ہے اور جریدۂ علم بھی۔ اس کی خوبیاں اپنے دوستوں سے بیان کیجیے اور انہیں آنکھ مچولی کے حلقۂ دوستی میں شامل کیجیے۔ یہ علم دوستی بھی ہو گی اور ایک بڑا علمی فائدہ بھی۔

طریقۂ کار جاننے کے لیے خصوصی پیشکش کا صفحہ دیکھیے

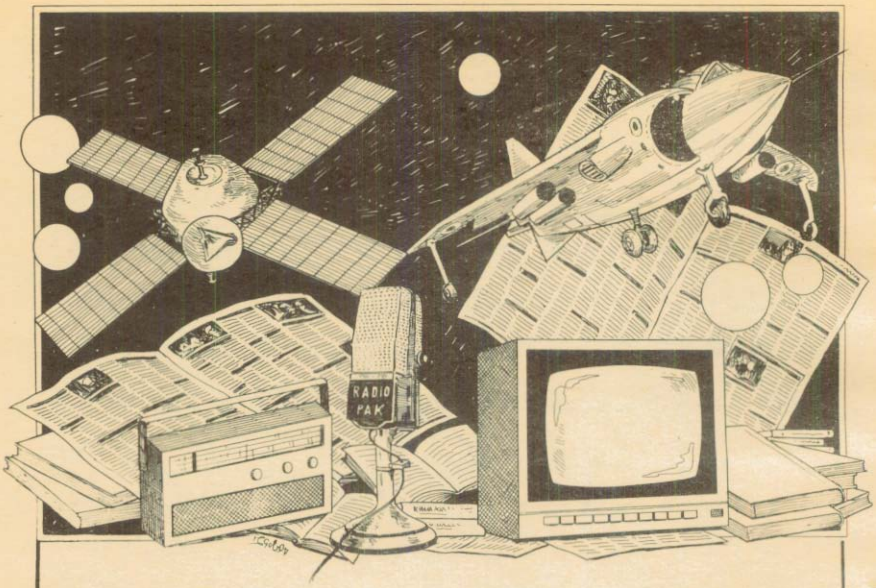

آئیے علم جمع کریں

ملاحت کلیم شیروانی

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ٹکٹ جمع کرنا، تصویریں جمع کرنا یا سکّے جمع کرنا تو سنا تھا لیکن "علم" جمع کرنا پہلی بار سنا ہے۔ لیکن اگر آپ ذرا سا غور کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ چیزیں جمع کرنا بھی تو دراصل "علم" ہی جمع کرنا ہے کیونکہ علم صرف کتابوں، رسالوں یا اخباروں میں ہی نہیں ملتا بلکہ آپ کے اطراف میں بکھری ہوئی تمام اشیاء کسی نہ کسی انسان کے اسی علم کا اظہار ہیں جو اس نے اپنی عقل و دانش کی مدد سے حاصل کیا ہے۔ جس طرح کوئی انسان مال و دولت جمع کرتا ہے تو اس کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ عیش و آرام کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ اچھے اور قیمتی کپڑے پہنتا ہے، بڑے بڑے گھر بناتا ہے، نئی نئی گاڑیاں خریدتا ہے کسی کو قدیم اشیاء اور نوادرات جمع کرنے کا شوق ہوتا ہے پھر وہ ان کے لئے کوئی عجائب گھر بناتا ہے اور ان اشیاء کی نمائش کرتا ہے۔ مختلف افراد اپنی خواہش اور پسند کے مطابق کسی نہ کسی شکل میں "دولت"

جمع کرتے ہیں اور اس کا اظہار کرتے ہیں اسی طرح جب کوئی شخص دنیا کی سب سے قیمتی دولت یعنی "علم" جمع کرتا ہے تو اس کا اظہار کرنے کے لئے ایجادات کرتا ہے کتابیں لکھتا ہے تہذیبی اور ثقافتی روایات کو فروغ دیتا ہے۔ علم کے علاوہ کسی طرح کی بھی دولت صرف اپنے مالک کو فائدہ پہنچاتی ہے بلکہ بعض اوقات اس کا اظہار کسی نہ کسی پریشانی کا سبب بھی بن جاتا ہے لیکن علم وہ دولت ہے جو اپنے مالک کے ساتھ ساتھ تمام انسانوں کو بھی فائدہ پہنچاتی ہے، اس کا اظہار ہمیشہ فائدہ مند ثابت ہوتا ہے اور سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس کو جتنا زیادہ خرچ کیا جائے اتنی ہی یہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے مالک کی عزت اور مرتبے میں بھی اضافہ ہوتا ہے پھر اس کے اطراف کے لوگوں تک اس کی روشنی پھیلتی ہے اور جلد ہی اس کے اچھے اثرات اس شخص کی پوری قوم اور ملک کو دنیا کی دوسری قوموں میں نمایاں مقام دلانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ "علم کی دولت" جمع کرنے کے صرف یہی نہیں اور بھی بے شمار فوائد ہیں اسی وجہ سے ہم نے سوچا ہے کہ آپ کو اس قیمتی دولت کو جمع کرنے کے طریقے بتائے جائیں۔

آیئے پہلے ہم ایک دفعہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لیں کہ "علم" ہے کیا اور اس کے معنی کیا ہیں۔ مختلف لغات میں (آپ یقیناً جانتے ہی ہوں گے کہ لغت وہ کتاب ہوتی ہے جس میں حروف تہجی کی ترتیب کے ساتھ الفاظ کے معنی اور ان کا استعمال وغیرہ بتایا جاتا ہے۔ "لغات" لغت کی جمع کو کہتے ہیں) لفظ علم کی وضاحت کچھ اس طرح کی گئی ہے عربی زبان میں اس کے معنی دیئے گئے ہیں "حقیقتِ شے کا ادراک" یعنی کسی چیز کی حقیقت کو جاننا"۔ فارسی کی لغت میں اس کے معنی جاننا، آگاہ ہونا، اور عقل و دانش۔ اردو کی لغت میں اس کے معنی آگاہ ہونا، جاننا یا عقل و دانش حاصل کرنا لکھے گئے ہیں۔ انگریزی کی مختلف لغات میں تقریباً یہی معنی ملتے ہیں مثلاً چیمبرز فیملی ڈکشنری (Chambers Family Dictionary) میں "علم" یعنی (Knowledge) کے یہ معنی دیئے گئے ہیں "سیکھنا، تجربات کے ذریعے معلومات حاصل کرنا کسی چیز کے بارے میں واقفیت رکھنا۔" مختلف لغات کی ان تمام تعریفوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ "علم حقیقت کو سمجھنے، چیزوں کو جاننے اور معلومات حاصل کرنے کا نام ہے جس کے نتیجے میں انسان کی عقل اور دانش میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔"

آپ میں سے اکثر نے ابتدائی دور کے انسانوں کے بارے میں پڑھا ہوگا کہ وہ کس طرح غاروں میں رہتا تھا، پتھروں سے شکار کر کے غذا حاصل کرتا تھا اور درختوں کی چھال کے کپڑے پہنتا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے ترقی کی منزلیں طے کرنی شروع کیں غاروں سے نکلا گھروں میں آباد ہوا زمین پر شہر بسائے اب

آسمانوں پر اس کی پرواز ہے۔ روز مرہ کی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کتنی انواع واقسام کی چیزیں اب اس کے پاس ہیں۔ ان کے علاوہ ایسے سائنسی وتکنیکی طریقے موجود ہیں جن کی مدد سے وہ اب دور دراز کے علاقوں کے رہنے والوں کے بارے میں بھی اتنا زیادہ باخبر ہوتا ہے جتنا اپنے بالکل نزدیک پڑوسی کے بارے میں جانتا ہے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ انسان نے یہ سب کچھ کس طرح حاصل کیا؟ جی ہاں صرف اور صرف "علم" کی مدد سے جسے خدا نے کائنات کے ہر ذرے میں چھپا دیا پھر انسان کو سمجھنے کی صلاحیت یعنی "عقل" عطا کی ڈھونڈنے اور جاننے کی خواہش یعنی "جستجو" بخش دی۔ جن کی مدد سے اس نے یہ پوشیدہ علم تلاش کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ ابتدائی دور کے ان انسانوں نے یعنی موجودہ انسان کے آباؤاجداد نے بعد میں آنے والی نسلوں پر ایک احسان یہ بھی کیا کہ اپنے اس علم کو کسی نہ کسی شکل میں محفوظ بھی کر دیا تاکہ وہ اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس طرح ایک کے بعد ایک آنے والی نسل اپنے بزرگوں کے محفوظ کئے ہوئے علم کی مدد سے اپنے علم میں اضافہ کر کے اسے اپنے بعد آنے والوں کے لئے محفوظ کرتی چلی گئی۔ آج ہمارے اطراف میں بکھری ہوئی سائنسی وتکنیکی دنیا نے ترقی کی اس منزل تک پہنچنے کے لئے "علم" کے اس محفوظ شدہ خزانے کی مدد لی ہے۔

ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہم انسانی ارتقاء کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جس میں "علم" کا حصول بہت زیادہ آسان ہے کیونکہ جہاں انسان نے دوسری ضروریات زندگی کے لئے بے شمار چیزیں ایجاد کی ہیں وہاں علم کو حاصل اور علم کو جمع کرنے کے بھی بہت سارے طریقے ایجاد کئے ہیں مثلاً طباعت ہے یعنی کتابیں، رسالے، اخبار وغیرہ چھاپنا جن میں دنیا بھر کی معلومات اور خبریں جمع کی جاتی ہیں۔

مختلف ذرائع ابلاغ ہیں یعنی وہ آلات جن کی مدد سے ایک یا ایک سے زیادہ افراد "علم" اور دنیا بھر کی معلومات و خبروں کو دوسرے بہت سارے افراد تک پہنچایا جاسکتا ہے مثلاً ریڈیو، ٹیلیویژن، فلمیں وغیرہ۔ اچھا بھئی اب ہم آپ کو آئندہ اسی مضمون کے دوسرے حصے میں بتائیں گے کہ آپ خود اپنی ذات کے لئے علم کیسے حاصل کر سکتے ہیں اور اس کو کس طرح محفوظ کر سکتے ہیں۔

ایک صاحب کسی پارٹی میں تشریف لے گئے ایک خاتون نے ان صاحب سے پوچھا "کیا آپ کے پاس ماچس ہوگی؟" ان صاحب نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا "یہ لائیٹر لے لیجئے" خاتون نے ڈانٹ کر جواب دیا "بھلا میں لائیٹر سے اپنے دانت کیسے کرید سکتی ہوں بد تمیز"

دُودھ کی بدولت

ریشم جیسے بال — نرم ملائم کھال

روشن روشن آنکھ — موتی جیسے دانت

کہتے ہیں کہ "صحت مند جسم صحت مند ذہن کی علامت ہے"

ماہرین برسوں کی تحقیق کے بعد دُودھ کو مکمل غذا اور صحت مند جسم کی ضمانت قرار دیتے ہیں۔

اللہ میاں نے دُودھ میں کیلشیم، پروٹین وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا متوازن مقدار میں شامل کر دیے ہیں۔ یہی وہ اجزا ہیں جو اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہیں۔

اگر آپ نے ہر روز دو گلاس دُودھ پینا اپنی عادت بنا لیا تو گویا آپ نے صحت مندی کا راز پا لیا۔

دانائی کی بات سنو

دُودھ پیو — مضبوط بنو

اشتہار برائے بہبود اطفال، منجانب آنکھ مچولی۔ کراچی

انوکھا انتقام

نعمان طاہر شمسی

ہم لوگ اپنی گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر گئے۔ ہمارے ماموں پنجاب کے ایک گاؤں نور پور میں رہتے تھے۔ میرے ساتھ میرے بڑے بھائی بھی تھے۔ نور پور پہنچ کر ہم نے ناشتہ کیا، پھر میں اپنے ماموں زاد بھائی اختر کے ساتھ گاؤں کی سیر کو نکل گیا، لہلہاتے کھیت مجھے بہت اچھے لگے ہم کافی دیر تک گھومتے رہے اور باتیں کرتے کرتے گاؤں سے باہر نکل آئے۔ اب ہمارے سامنے ایک عظیم الشان کھنڈر نما حویلی تھی جس کی دیواروں پر کائی جمی ہوئی تھی۔ یہ حویلی مجھے بہت اچھی لگی، میں اُسے اندر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے ماموں زاد بھائی اختر سے کہا۔

"یار اختر! مجھے اس حویلی کی سیر کراؤ۔ لگتا ہے انگریزوں کے زمانے کی بنی ہوئی ہے۔"

"نا بابا نا یہ تو بھوت حویلی ہے، اس میں تو بھوت رہتے ہیں۔" اختر نے ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔ مجھے اختر کی بات سُن کر ہنسی آگئی۔ "چھوڑو یار آج کل ٹیکنالوجی کا دور ہے ایسے زمانے میں بھوت پریت کہاں۔ مجھے تو دُکھ ہے تم اتنے پڑھے لکھے ہونے کے باوجود ایسی باتیں کرتے ہو۔"

"نہیں یار میں صحیح کہہ رہا ہوں، تم ابّو سے پوچھ لینا۔ آؤ واپس چلیں ہمیں کافی دیر ہوگئی ہے۔ گھر والے ہمارا انتظار

کر رہے ہوں گے۔" اختر یہ کہہ کر واپس گھر کی طرف چلنے لگا۔ میں بھی یہ سوچ کر اختر کے ساتھ ہو چلا کہ گھر جا کر ماموں جان سے پوچھوں گا۔ گھر میں سبھی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھایا پھر ہم لوگ بیٹھک میں بیٹھ گئے۔ میں نے ماموں جان سے پوچھا۔

"ماموں جان یہ اختر مجھ سے کہہ رہا تھا یہ گاؤں کے باہر جو حویلی ہے آسیب زدہ ہے۔"

"ارے بیٹے یہ بات کچھ کچھ صحیح بھی ہے اور غلط بھی میں تمہیں اس حویلی کی کہانی سناتا ہوں۔" ماموں جان ہنستے ہوئے بولے۔

"یہ کہانی آج سے تقریباً سو سال پہلے کی ہے۔ جب یہاں پر انگریزوں کی حکومت تھی۔ اور ہندوستان اور پاکستان ایک تھا۔ اس حویلی میں ایک امیر لارڈ رہتا تھا جو یہاں صرف چھٹیاں گزارنے آتا تھا۔ اس حویلی میں ایک باورچی اور اس کا بیٹا رہتا تھا۔ لارڈ کا نام ہیگن تھا۔ سب اُسے لارڈ ہیگن کہتے تھے۔ وہ بہت سخت مزاج تھا اور ملازموں کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کرتا تھا۔ اس کا ملازم اسفنتو تھا جو کہ اپنے مالک سے بہت ڈرتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سردیوں کے دن تھے۔ لارڈ ہیگن حویلی میں آیا ہُوا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں داخل ہُوا تو اُس نے دیکھا کہ اُس کے ملازم کا لڑکا جارج آتش دان کے کوئلے صحیح کر رہا ہے۔

"یہ تم یہاں کیا کر رہے ہو لڑکے، چلو اٹھو جاؤ یہاں سے"۔ لارڈ ہیگن نے لڑکے سے کہا۔ اُسی وقت بجلی زور سے کڑکی اور باش ہونے لگی۔ وہ لڑکا خاموشی سے اُٹھا اور ہاتھ جھاڑتے ہوئے کمرے سے جانے لگا۔

"اے لڑکے سنو! یہ صوفے پر کالے دھبے تم نے لگائے ہیں" لارڈ ہیگن نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر کالے دھبے لگے ہوئے تھے سفید بے داغ صوفوں پر یہ دھبے بہت بُرے لگ رہے تھے۔

"صاحب جی شاید مجھ سے ہی لگے ہیں" لڑکے نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"تم نے سارے صوفے کا ستیاناس کر دیا" یہ کہہ کر لارڈ ہیگن نے بچے کے ایک زوردار تھپڑ مارا، لڑکا لڑکھڑا کر گرا۔ اس کا سر آتش دان کے کونے پر اُبھرے ہوئے پتھر سے ٹکرایا اور اُس کی پیشانی سے سُرخ رنگ کی ایک لکیر اُس کے چہرے پر پھیل گئی اور وہ لڑکا بغیر حرکت کیے زمین پر گر گیا۔

"اچھا اچھا اٹھو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے ایک تھپڑ میں ہی گر گئے" جارج ہیگن نے بچے سے کہا لیکن بچے کے جسم میں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر لارڈ ہیگن گھبراہٹ میں آگے بڑھا اور لڑکے کو سیدھا کیا۔ لڑکے کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں، اور اُس کے پورے چہرے پر خون پھیلا ہُوا تھا۔

"یہ کیا ہُوا میں نے ... میں نے تو اسے نہیں مارا۔ میں نے نہیں مارا" لارڈ ہیگن کے منہ سے یہ الفاظ بے ترتیبی سے نکلے۔ اُسی وقت دروازہ کھلا اور اسفنتو داخل ہُوا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک پتلی سی لڑی بہہ رہی تھی اور وہ چپ چاپ اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔

"اسفنتو! بخدا میں نے ... میں نے یہ سب نہیں کیا تم میری بات پر یقین کرو۔ اسفنتو! میں نے تو اُسے ذرا ہاتھ مارا پھر پتا نہیں کیسے یہ سب کچھ ... کیسے ہو گیا" لارڈ ہیگن نے اسفنتو کی طرف منہ کر کے کہا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی تھی اور وہ پسینے میں نہا رہا تھا۔

"صاحب میں اسے باغ کے مشرقی کونے میں دفن کر دیتا ہوں" یہ کہہ کر غیر معمولی صابر و شاکر اسفنتو آگے بڑھا اور جھک کر جارج کی لاش کو اُٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔

لارڈ ہیگن نے کھڑکی میں کھڑے ہو کر پائیں باغ کی طرف دیکھا۔ اسفنتو بارش میں بھیگا ہُوا پھاوڑے کی مدد سے مٹی کھود رہا تھا۔ اور ایک طرف جارج کی لاش پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر لارڈ ہیگن نے ایک جھرجھری لی اور کھڑکی سے ہٹ گیا۔ تقریباً دو گھنٹے بعد کمرے کا دروازہ چرچراہٹ کے ساتھ پھر کھلا اور اسفنتو اندر داخل ہُوا۔ اس کا لباس پانی میں بھیگا ہُوا تھا۔

"صاحب میں نے جارج کو باغ کی مشرقی جانب دفن کر دیا ہے۔ اب آپ مجھے چھٹی دے دیجئے۔ میں پانچ سال سے گھر نہیں گیا"

"اسفنتو! تم نے مجھے معاف کر دیا نا؟ ہاں ضرور تم کچھ عرصے کے لئے گھر ہو آؤ۔ یہ لو یہ پیسے بھی رکھ لو" یہ کہہ کر لارڈ ہیگن نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر اُس کی جانب بڑھا دیئے۔

"نہیں صاحب! آپ یہ پیسے رکھ لیجئے بس مجھے اجازت دے دیجئے" اسفنتو نے کہا۔

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی" یہ کہہ کر لارڈ ہیگن کرسی سے اُٹھا اور زندگی میں پہلی بار کسی ملازم سے ہاتھ ملایا۔ اُس کے بعد اسفنتو وہاں سے چلا گیا۔ دوسری صبح لارڈ ہیگن بھی حویلی میں تالا لگا کر انگلستان چلا گیا۔

تقریباً دو سال کے بعد چھٹیاں گزارنے لارڈ ہیگن حویلی آیا۔ وہ اس واقعہ کو تقریباً بھول گیا تھا۔ جب وہ حویلی میں داخل ہُوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ حویلی اندر سے صاف ہو رہی تھی جیسے اُس کی صفائی کچھ ہی دیر پہلے کی گئی ہو۔ پھر مصروفیات میں وہ اس بات کو بھول گیا۔ جب رات کو وہ سونے کو لیٹا تو اُس کے ہاتھ میں ایک انگریزی ناول تھا۔ ناول پڑھنے میں وہ اتنا محو تھا کہ اُسے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہُوا۔ جب ناول ختم ہُوا تو اُس نے گھڑی دیکھی۔ گھڑی میں بارہ بج کر تین منٹ ہوئے تھے حویلی پر سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ اُس نے سونے کے لئے آنکھیں بند کیں۔ ابھی دس منٹ ہی گزرے تھے کہ اُسے حویلی کے اُوپری زینے پر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ وہ اس آواز کو وہم سمجھا لیکن پھر بھی اُس کا ذہن اس آواز کی طرف چلا گیا۔ آہستہ آہستہ قدموں کی آواز اس کے دروازے پر آ کر رُک گئی۔ لارڈ ہیگن کا پورا جسم پسینے میں ڈوبا ہُوا تھا۔ سردی سخت ہونے کے باوجود اُس نے کمبل نہیں اوڑھا تھا۔ حویلی کے سکوت میں دروازے کی چرچراہٹ کی آواز عجیب معلوم ہوئی۔ دروازہ پورا کھلا اور پھر آہستہ آہستہ بند ہو گیا اس کے بعد پورے کمرے میں پسینے کی بُو پھیل گئی۔ اور کسی کے بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ آوازیں آہستہ آہستہ تیز ہوتی گئیں۔ لارڈ ہیگن اس صورتحال کو برداشت نہیں کر سکا۔ اور بے ہوش ہو گیا۔

جب اُس کو ہوش آیا تو اُس نے اپنے اُوپر ڈاکٹر ہیڈلے کو جھکے پایا۔ اُن کے ساتھ اُس کے پڑوسی پیٹر ہاڈسن کھڑے تھے۔

"آپ کو ہوش آگیا ہیگن صاحب" ڈاکٹر ہیڈلے نے اُن سے پوچھا۔

"وہ میں... مگر آپ یہاں کیسے آئے؟" لارڈ ہیگن نے پوچھا۔

"مجھے تو پیٹر صاحب نے بُلوایا تھا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ مجھے کچھ اور مریض بھی دیکھنے ہیں" یہ کہہ کر ڈاکٹر ہیڈلے کمرے سے نکل گیا۔

"تم نے ڈاکٹر کو کیسے بلوایا۔ اور تمہیں کیسے معلوم ہُوا کہ میں بے ہوش ہو گیا ہوں؟" لارڈ ہیگن نے پیٹر ہاڈسن سے پوچھا۔

"مجھے تو تمہارے ملازم کے لڑکے جارج نے بتایا تھا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، پھر حاضر ہوں گا" یہ کہہ کر پیٹر کمرے سے باہر نکل گیا۔

"جارج، مگر وہ تو... مر گیا" یہ لفظ لارڈ ہیگن کے منہ ہی میں رہ گئے۔ اس کی آنکھیں حیرت اور خوف سے پھیل گئی تھیں۔

اس واقعے کو گزرے ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ ایک انوکھا واقعہ پیش آیا۔ لارڈ ہیگن اپنی لائبریری میں بیٹھا انگریزی ناول کا مطالعہ کر رہا تھا کہ اُس کے کانوں میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ قدموں کی دھمک بڑھتی گئی پھر فضا میں ایک ہولناک چیخ گونج اُٹھی۔ یہ چیخ سُن کر لارڈ ہیگن کے حواس جواب دے گئے۔ اور وہ بے ہوش ہو گیا۔

جب لارڈ ہیگن کو ہوش آیا تو اُس نے خود کو لائبریری روم کے بجائے اپنی خوابگاہ میں لیٹے پایا۔ لارڈ ہیگن بہت حیران ہُوا کہ وہ لائبریری سے خواب گاہ میں کیسے آگیا۔ فضا میں سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ یکایک دروازہ آہستہ آہستہ چرچراہٹ کے ساتھ کھُلا اور روشنی کا ایک ہالہ اندر داخل ہُوا۔ لارڈ ہیگن کا پُورا جسم پسینے میں ڈوبا ہُوا تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ روشنی کے ہالہ کے درمیان جارج نے سفید رنگ کا لمبا لبادہ اوڑھا ہُوا تھا۔ لارڈ ہیگن کے منہ سے دہشت کے مارے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ جارج آہستہ آہستہ چلتا ہُوا مسہری کے قریب آگیا۔ اُس کے دونوں ہاتھ لارڈ ہیگن کی گردن کی طرف بڑھے یہ دیکھ کر لارڈ ہیگن کی دہشت کے مارے دل کی حرکت بند ہو گئی اور وہ خوف کے مارے مر گیا۔

قصہ مختصر یہ کہ اصل میں لارڈ ہیگن کے ملازم اسفنتو کے دو جڑواں بیٹے تھے۔ ایک گاؤں میں رہتا تھا جب کہ دوسرا اسفنتو کے ساتھ حویلی میں رہتا تھا۔ اپنے دوسرے بیٹے کے مرنے کے بعد اسفنتو واپس اپنے گاؤں گیا اور پہلے والے جڑواں لڑکے کو لے کر واپس حویلی آیا۔ اس طرح یہ ایک انوکھے انتقام کی داستان ختم ہوئی۔ جب سے اب تک حویلی میں لارڈ ہیگن کی روح گھومتی رہتی ہے"

یہ کہہ کر ماموں جان خاموش ہو گئے۔ میں کچھ عرصے نور پور رہ کر واپس گھر آگیا۔ لیکن یہ واقعہ میرے ذہن سے محو نہ ہو سکا...

یہ نیکی نہیں ہے

ذیشان بن صفدر

اُردو محل اسکول شہر کے اُن چند معروف اور گنے چُنے اسکولوں میں سے ایک تھا جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ بچّوں کے کردار کی تعمیر پر بھی خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

اسکول کی انتظامیہ نصاب اور امتحان پر تو زور دیتی ہی تھی... مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ اخلاقی قدروں کو اجاگر کرنے اور طلبا کو اچھے کردار کا حامل بنانے کے لیے بھی کوشاں رہتی اور یوں اس اسکول سے تعلیم

مکمل کر کے نکلنے والے لڑکے تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق و کردار کے بھی حامل ہوتے۔

ساتویں کلاس کے طلبہ سارے پرچوں کے امتحانات سے فارغ ہو چکے تھے۔ اب صرف کردار سازی کے سلسلے کا ایک عملی امتحان باقی تھا۔ اُس دن ہر طالب علم کے چہرے پر بس ایک ہی سوال لکھا صاف نظر آرہا تھا کہ اس بار دیکھیے عملی امتحان کے لیے کیا سوال آتا ہے۔ طلبہ اسی عملی امتحان سے خاص طور پر خوفزدہ رہتے اور گھبراتے تھے۔ مروّجہ نصاب کے متعلق تو اُنہیں علم ہوتا کہ فلاں سبق میں کیا ہے ... کن کن سوالوں کے جواب کیا ہیں ... پھر اُنہیں یہ بھی اطمینان ہوتا کہ جہاں تک کلاس میں پڑھایا گیا ہے وہیں سے پوچھا جائے گا ... طلبہ آپس میں ایک دوسرے ساتھی سے بات چیت کرتے ہوئے خیال آرائی میں مصروف تھے۔ کہ تب ہی کلاس ٹیچر اشفاق سر کلاس میں داخل ہوئے۔ خلافِ معمول ان کے ہمراہ ایک اجنبی تھا جس نے نہایت قیمتی لباس زیب تن کیا ہوا تھا ... اور اس کے ہاتھ میں بہت ہی نفیس قسم کا بریف کیس تھا۔ سب طلبا اُن کے احترام میں اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے ... کلاس ٹیچر کے بیٹھ جانے کے بعد سارے طالب علم بھی خاموشی کے ساتھ اپنی اپنی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

اشفاق سر نے حامد سے ایک اور کرسی باہر سے منگائی اور اپنے ساتھ آئے ہوئے شخص کا ساری کلاس سے تعارف کراتے ہوئے کہنے لگے ... "بچو ... یہ صاحب جو میرے ساتھ آئے ہیں۔ ان کا نام وقاص احمد ہے۔ یہ رفاہی کام کے سلسلے میں آپ لوگوں سے تعاون چاہتے ہیں۔ امید ہے آپ ان کی باتیں نہایت توجہ سے سُنیں گے اور پھر ان کی مدد کرنے میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیں گے۔"

اشفاق سر کی بات ختم ہونے کے ساتھ ہی حامد کرسی لے کر کلاس میں داخل ہوا۔ اور اُسے اشفاق سر کی کرسی کے برابر میں رکھ کر اپنی جگہ آ بیٹھا ... وقاص احمد صاحب بھی کرسی پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور اُس میں سے چند رسید بکس نکال کر سامنے رکھ لیں۔ ساری کلاس بڑے تجسّس اور اشتیاق سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ سر اشفاق نے ساری کلاس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا "بچو ... آج آپ کی کردار سازی کا عملی امتحان ہونا تھا نا ..."

جواب میں سب لڑکے ایک ساتھ بولے "جی ..."

اشفاق سر نے کہا "فی الحال آپ لوگ وقاص احمد صاحب کی گفتگو سُنیں، کردار سازی کے عملی امتحان کے متعلق میں بعد میں بتاؤں گا۔"

یہ سُنتے ہی لڑکوں کے مرجھائے چہرے شگفتہ گلابوں کی طرح کھل گئے۔

کچھ دیر توقف کے بعد سر اشفاق نے پھر کہا "اچھا تو اب میں آپ کے اور وقاص احمد صاحب کے درمیان سے ہٹتا ہوں باقی باتیں وقاص احمد صاحب خود آپ لوگوں کو بتائیں گے" یہ کہہ کر وہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ اور اُن کے بیٹھتے ہی وقاص احمد صاحب کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے جیب سے ایک رومال نکال کر اپنے چشمے کو صاف کیا پھر اُسے آنکھوں پر ٹھیک سے جماتے ہوئے "السلام علیکم" سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔

وقاص احمد صاحب نے کہا "بچو۔۔۔! میرے پاس مختلف انعامی ٹکٹ ہیں۔۔۔ ان انعامی ٹکٹوں کی آمدنی سے رفاہِ عامّہ کے کئی کام انجام دیے جاتے ہیں، کچھ شفاخانے، ڈسپنسریاں، ایمبولینس، ناگہانی آفات کے سلسلے میں متاثرین کی امداد کی جاتی ہے۔ ان انعامی ٹکٹوں کی قرعہ اندازی کے موقعے پر عوام کے نمائندے بھی بڑی تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ میرے پاس پانچ روپے اور دس روپے کی مالیت والے انعامی ریفل ٹکٹ ہیں۔ پانچ روپے والے انعامی ٹکٹ پر پہلا انعام دو لاکھ روپے، دوسرا انعام ایک لاکھ روپے اور تیسرا انعام دس دس ہزار روپیہ دس مختلف ٹکٹوں پر چوتھا اور آخری انعام ایک ایک ہزار روپیہ سو مختلف ٹکٹوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔۔۔ دس روپے والے انعامی ٹکٹ پر پہلا انعام تین لاکھ روپے ہے۔ دوسرا انعام ایک ایک لاکھ روپے دو ٹکٹوں پر۔۔۔ تیسرا انعام پچاس پچاس ہزار روپیہ دو ٹکٹوں پر، چوتھا انعام دس دس ہزار روپے پانچ ٹکٹوں پر اور پانچواں انعام ایک ایک ہزار روپے سو ٹکٹوں پر تقسیم کیا جاتا ہے۔۔۔" اتنا کہنے کے بعد وقاص صاحب ذرا رُکے۔۔۔ اُنہوں نے طلبہ کے چہروں پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔۔۔ اور پھر اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "عزیز بچو۔۔۔ اور ہونہار طالبعلمو۔۔۔۔۔

ممکن ہے کہ آج قسمت کی پری آپ پر مہربان ہو۔۔۔ اور پانچ یا دس روپے کی مالیت کا لیا ہوا کوئی بھی ٹکٹ آنے والی کل میں آپ کو لاکھوں یا ہزاروں کا مالک بھی بنا دے۔۔۔ انعام میں ملنے والی یہ بھاری سی رقم آپ کی بہت سی آرزوؤں اور خواہشوں کو پُورا کر سکتی ہے۔ آپ کے گھر کی بہت سی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے۔۔۔ آپ کے آئندہ تعلیمی مصارف میں کام آ سکتی ہے۔ الغرض آج کے پانچ یا دس روپے آنے والے کل میں آپ کے لیے خوشیوں کا پیغام بن سکتے ہیں۔ یہ پانچ اور دس روپے کی چھوٹی سی رقم بڑھ کر بہت بڑی رقم ہو سکتی ہے، اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس ٹکٹ کو خریدنے کے بعد اگر کوئی انعام نہ بھی نکلے تو نیک کاموں میں مدد دینے کا ثواب اور اجر تو کہیں گیا ہی نہیں۔ جس کے لیے خود اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے"

وقاص احمد صاحب نرم، گرم اور لچھے دار باتوں کا جال پھیلا رہے تھے اور ساتویں کلاس کے طلبہ ان کی تقریر سے سخت متاثر نظر آ رہے تھے۔

"میرے عزیز طالب علمو" !

انہوں نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ جو میرے پاس ریفل ٹکٹ ہیں۔ یہ محض انعامی ٹکٹ ہی نہیں' آپ کی طرف سے نیک کاموں میں دیے جانے والی عطیے کی پکّی رسید بھی ہے ... یہ کوئی فراڈ دھوکہ یا جعل سازی نہیں۔ آپ کی اس عطیاتی رقم سے ہی فلاحی اداروں کی سرگرمیاں جاری و ساری رکھی جا سکتی ہیں۔ ان ٹکٹوں پر ملنے والا انعام تو دراصل اس دنیا کا معمولی سا انعام ہے۔ اصل انعام تو اللہ کی خوشنودی اور رضامندی ہے۔ آپ لوگ یہ انعامی ٹکٹ خرید کر کسی بھی طرح گھاٹے میں نہیں رہیں گے۔" ان الفاظ کے ساتھ وقاص صاحب نے اپنی تقریر ختم کی اور یہ کہتے ہوئے کلاس ٹیچر صاحب کے برابر میں رکھی کرسی پر بیٹھ گئے کہ جن طلبہ کو جتنی مالیت کے ٹکٹ درکار ہوں وہ مجھ سے باری باری آ کر لے لیں"۔

لڑکے آپس میں سرگوشیوں کے ساتھ ایک دوسرے سے مشورے کرنے لگے۔ کچھ طلبہ کے کھلے ہوئے چہروں پر افسردگی سی چھا گئی۔ طلبہ کی اس کیفیت کو وقاص احمد صاحب بھی دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک اچھے اور منجھے ہوئے سیلز مین تھے۔ وہ طلبہ کی سرگوشیوں اور کچھ مُسکراتے چہروں پر افسردگی کے بادل چھا جانے کا مطلب سمجھ گئے۔ فوراً اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور ساری کلاس کو مخاطب کر کے کہنے لگے۔

"میرے عزیز بچّو۔

ممکن ہے کچھ طلبہ کے پاس آج یہ لکّی انعامی ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوں اور وہ خریدنا چاہ رہے ہوں تو وہ فکر نہ کریں۔ جس طالب علم کے پاس اس وقت پورے پیسے نہیں ہیں۔ اور وہ ٹکٹ خریدنا چاہتے ہیں تو وہ اپنے نام لکھوا کر مجھ سے ٹکٹ لے لیں اور کل اپنے کلاس ٹیچر کو رقم ادا کر کے اپنا نام لِسٹ میں سے کٹوا دیں"۔

یہ رعایت سُنتے ہی کلاس فلک شگاف تالیوں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ کلاس ٹیچر صاحب نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش کیا اور ایک کاغذ نکال کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ اور حاضری

رجسٹر کی مدد سے سلسلے وار طلبہ کے نام لکھنے شروع کر دیے۔ سیریل نمبر کے لحاظ سے سب سے پہلا نام جاوید کا تھا۔ انہوں نے جاوید کو بلا کر کہا" کہیے جاوید میاں آپ کون سا انعامی ٹکٹ خریدنا پسند کریں گے؟ ۵ روپے یا دس روپے والا۔ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو ابھی ادا کر دیں ورنہ کل لیتے آئیے گا"۔

جاوید نے کہا" سر۔ مجھے دو ٹکٹ، ایک دس اور ایک پانچ والا دے دیں اور یہ لیں اس کی رقم پندرہ روپے"۔ جاوید کے بعد بشیر، سلیم، انور، اختر نے ٹکٹ خریدے۔ کسی نے صرف پانچ یا دس والا خریدا۔ کسی نے دونوں ٹکٹ لیے۔ کچھ طلبہ ایسے بھی تھے جنہوں نے کل کی ادائیگی کے وعدے پر ٹکٹ لیے۔ جب ساری کلاس ٹکٹ خرید چکی تو کلاس ٹیچر صاحب نے فہرست پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ ۳۵ لڑکوں کی کلاس میں سے سات طلبہ کے نام مارک ہونے سے رہ گئے تھے۔

ان میں راشد، طاہر اور نوید تو غیر حاضر تھے۔ دو نے تو رخصتِ علالت کی درخواست بھجوائی تھی جبکہ ایک اتفاقی اور نہایت اہم ضرورت کے تحت اسکول نہیں آسکا تھا۔ ارمغان، جلیس، تیمور اور دانش کلاس میں حاضر تھے مگر ان کے نام بغیر نشان کے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے ٹکٹ نہیں خریدے۔

اشفاق صاحب نے سب سے پہلے ارمغان سے سوال کیا۔

" ارمغان بیٹے۔ کیا بات ہے آپ نے کوئی ٹکٹ نہیں لیا۔ ارے بھئی پیسے آج نہیں ہیں تو کل دے دیجیے گا"۔

" آپ کے بہت سے ساتھیوں نے کل کی ادائیگی کے وعدے پر ٹکٹ لیے ہیں۔ آپ بھی لے سکتے ہیں۔ کیا خبر وہ لکی نمبر والا ٹکٹ آپ کی ہی قسمت میں ہو۔ کیا آپ کی خواہش نہیں ہے کہ بغیر محنت کیے ڈھیر ساری رقم کے آپ مالک بن جائیں"۔

ارمغان ہچکچاتا ہوا اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ پھر ادب سے جواب دیتا ہوا بولا" جی نہیں سر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پیسے تو اس وقت بھی میرے پاس ہیں۔ مگر مجھے میرے ابو نے سمجھایا ہے کہ انعامی ٹکٹ ایک قسم کا جوا ہیں اور جوا بہت بُری چیز ہے"۔

ارمغان کا جواب سُن کر وقاص احمد صاحب کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ وہ سوچنے لگے کہ

اس لڑکے (ارمغان) کی بات دوسرے ساتھیوں کی سمجھ میں آگئی تو وہ کہیں خریدے ہوئے ٹکٹ ہی واپس نہ کر دیں۔ فوراً اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر صفائی پیش کرتے ہوئے بولے۔

"میاں صاحبزادے۔ یہ انعامی ٹکٹ جُوا قطعی نہیں ہیں، ہم نے اس کے لیے حکومت سے اجازت بھی حاصل کی ہوئی ہے۔ یہ دیکھیے اجازت نامہ... جوئے اور انعامی ٹکٹ میں بڑا فرق ہے۔ آپ طالب علم ہیں، اس فرق کو سمجھیں۔"

"جناب... میں طالب علم ہوں اسی لیے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ یہ انعامی ٹکٹ سراسر جُوا ہیں"۔۔

ارمغان نے نہایت ادب سے وقاص احمد صاحب کو جواب دیا۔

اب وقاص احمد صاحب کے چہرے پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔ وہ ایک کامیاب سیلز مین تھا، مگر آج ایک طالب علم نے بڑے یقین کے ساتھ اس کی بات کو رد کر دیا تھا۔ اس نے سوچا عافیت اسی میں ہے کہ اس لڑکے کو سرے سے نظر انداز ہی کر دیا جائے وہ سمجھ گیا کہ ارمغان کو فی الحال ڈھب پر لانا ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ اُسے خاموش دیکھ کر کلاس ٹیچر نے جلیس کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا "جلیس میاں، آپ کہیے۔ آپ نے یہ انعامی ٹکٹ کیوں نہیں خریدا..."؟

جلیس اپنی جگہ کھڑے ہو کر ادب سے بولا.. "سر میں بھی ارمغان کے خیال سے متفق ہوں کہ یہ انعامی ٹکٹ ایک قسم کا جُوا ہیں"۔

"بیٹے... اگر یہ جُوا ہیں تو پھر انعامی بونڈ جو حکومت نے جاری کیے ہیں اور جن کی ہر ماہ قرعہ اندازی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے لوگ پرائز بونڈوں کی شکل میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ اسے کیا کہیں گے؟ کیونکہ انعامی ٹکٹوں اور پرائز بونڈ کے درمیان صرف سرکاری اور غیر سرکاری کا ہی تو فرق ہے..." سر اشفاق نے بڑی نرمی سے جلیس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"سر... زہر کو اگر شہد میں ملا دیا جائے تو وہ میٹھا تو ہو جائے گا، مگر اس کے اثرات میں فرق کوئی نہیں پڑے گا۔ پرائز بونڈ اگر حکومت نے جاری کیے ہیں تو وہ بھی جُوا ہی کہلائیں گے۔ جوئے میں بھی تو شرط لگتی ہے ایک کے دس ملتے ہیں۔ یہی فارمولا انعامی ٹکٹوں کا ہے اگر شرط پوری نہ ہو تو شرط پر لگائی ہوئی رقم ڈوب جاتی ہے۔ کیا ہماری کلاس میں جن جن لڑکوں نے

انعامی ٹکٹ خریدے ہیں۔ ان سب کو انعام ملیں گے؟ نہیں ... یہ انعام صرف اُن کو ملیں گے جن کا قرعہ نکلے گا... اس لحاظ سے یہ بھی جُوئے کی ایک شکل ہے ..."

وقاص صاحب نے دھیرے سے ان کا ہاتھ دبا کر بات وہیں ختم کرنے کا اشارہ کیا...

اشفاق صاحب نے تیمور اور دانش سے ایک ساتھ سوال کرتے ہوئے دریافت کیا... "اور بھئی آپ دونوں نے یہ انعامی ٹکٹ کیوں نہیں خریدے؟ اور دانش میاں آپ کے ابّو کی تو بہت ہی کم تنخواہ ہے۔ صبح سے شام تک بڑی سخت محنت کرتے ہیں اور تب مہینے کے بعد اُنھیں تنخواہ ملتی ہے ممکن ہے کہ آپ جو ٹکٹ خریدیں اُس پر پہلا انعام آپ کو ہی مل جائے۔ آپ کے ابّو اس رقم سے کوئی اچھا سا کاروبار کر کے گھر کی حالت بہتر بنا سکتے ہیں۔"

دانش پہلے تو اپنے کلاس ٹیچر صاحب کی بات سُن کر پاسِ ادب سے خاموش رہا۔ مگر تیمور نے کہنی مار کر اُسے جواب دینے کے لیے آمادہ کر لیا... وہ کچھ سوچتا ہوا بولا: "سر ہمارے ابّو نے ہمیں ایک حدیث کے حوالے سے سمجھایا تھا کہ فرمایا آنحضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جانتے ہو، مفلس کون ہے؟ لوگوں نے کہا، ہم مُفلس اُسے سمجھتے ہیں جس کے پاس روپیہ پیسہ اور سروسامان نہ ہو۔ آپؐ یعنی رسول اللہ نے فرمایا میری اُمّت میں مُفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزے زکوٰۃ کے ساتھ آئے گا، لیکن اُس نے کسی کو گالی دی ہوگی۔ کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا ہوگا۔ چنانچہ اس کی بعض نیکیاں اُس کو دے دی جائیں گی۔ جس کی اُس نے حق تلفی کی ہوگی۔ اور پھر اُسے دوزخ میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے اگر آپ نے ہمارے ابّو کو ضرورتمند اور غریب سمجھا تو یہ آپ کی بھُول ہے، وہ جو کچھ بھی کماتے ہیں، ہمارے گھر کے اخراجات اُس سے پُورے ہو جاتے ہیں۔ ہمارے ابّو کسی کے مقروض تو نہیں۔ اگر ہمارے گھر میں ٹی وی، فریج، یا ٹیپ ریکارڈ وغیرہ نہیں ہے تو ان کے بغیر بھی ہم لوگ خوشگوار اور پُرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ ابّو کہتے ہیں کہ محنت سے کمائی کر کے اگر بچت ہو گئی تو ہم بھی یہ چیزیں خرید لیں گے۔ محنت کے بغیر ملنے والی دولت میں برکت نہیں ہوتی۔ اور اس قسم کا پیسہ جائز بھی نہیں۔ اس لیے میں نے یہ ٹکٹ نہیں خریدا۔"

اشفاق صاحب نے تیمور کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا، جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اُس سے پوچھ رہے ہوں کہ بیٹے تیمور آپ کے خیالات کیا ہیں؟ تیمور نے کہا: "سر میں بھی دانش

کے خیالات سے متفق ہوں۔ میرے خیال میں اگر کسی نیک کام کے لیے کوئی عطیہ دیا جائے تو وہ خلوصِ نیت کے ساتھ ہونا چاہیے۔ صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی کے لیے۔ وقاص صاحب کو رفاہی کاموں کے لیے عطیہ درکار ہے تو وہ ہم ٹکٹ لیے بغیر ہی دے دیں گے۔ اور یہ بھی چاہیں گے کہ ہماری عطیاتی رقم کا اعلان بھی نہ کیا جائے۔ اس کی تشہیر نہ کی جائے، کیونکہ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اگر تم اپنے کسی بھائی کی مدد کرو تو اس طرح کہ تمہارے دوسرے ہاتھ کو بھی اس کی خبر نہ ہو۔ انعام کے لالچ میں عطیاتی ٹکٹ خریدنا کسی طرح سے بھی نیکی نہیں کہلائی جاسکتی۔ یہ تو سراسر انعام کا لالچ دے کر عطیہ وصول کرنا ہوا۔ جہاں لالچ آجائے، وہاں نیکی نہیں رہتی۔۔۔"

دونوں بڑوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ ہولے سے مسکرائے اور اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ وقاص صاحب نے ناموں کی فہرست، اور ٹکٹوں کی کاپیاں سنبھال کر اپنے بریف کیس میں رکھیں اور "وش یو گڈ لک بچو" کہتے ہوئے کلاس رُوم سے چلے گئے۔

دونوں بڑے جیسے ہی کلاس سے باہر نکلے لڑکوں نے ان چاروں کو گھیر لیا۔ اور ان کے خیالات کا مذاق اُڑانے لگے ... سب سے زیادہ مذاق کا نشانہ جلیس، تیمور اور دانش تھے۔

جاوید، جس نے سب سے پہلے ٹکٹ خریدا تھا ان مذاق اُڑانے والوں میں پیش پیش تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔۔ "قرعہ اندازی میں میرا ہی پہلا انعام نکلے گا۔ تین لاکھ روپے۔ میں اس سے کاروبار کروں گا اور ان محنت پسند لڑکوں کو اپنا ملازم رکھ لوں گا۔ اگر محنت کرنے سے حالت سدھرتی تو دنیا میں محنت کرنے والے کروڑوں انسان غریب نہ رہتے"۔ دوسرے لڑکے نے ٹکڑا لگایا۔

"بھئی اپنے دانش میاں تو کسی مسجد کے مولوی ہی بنیں گے"۔

کلاس کیا تھی، اچھا خاصا مچھلی بازار بن چکا تھا۔ کہ "خاموش ... خاموش" کی آواز سے سب چونک پڑے۔ کلاس میں ہیڈ ماسٹر صاحب کھڑے انہیں خاموش کرا رہے تھے۔ ان کی شکل دیکھتے ہی سب کو

گویا وہ آپس میں پوچھ رہے ہوں کہ یہ امتحان کب اور کیسے ہوا؟

ہیڈ ماسٹر صاحب ان کی حیرانی پر مسکراتے ہوئے بولے۔

"بچو... ابھی آپ کی کلاس میں آپ کے کلاس ٹیچر صاحب وقاص صاحب کی مدد سے جو انعامی ٹکٹ فروخت کر رہے تھے۔ وہ آپ کا امتحان ہی تھا۔ جن بچوں نے انعام کے لالچ میں ٹکٹ خریدے وہ سب فیل ہیں اور جنہوں نے ترغیب کے باوجود انعامی ٹکٹ خریدنے سے انکار کر دیا اور اُسے جُوا قرار دیا وہ پاس ہیں۔ میں آپ کی کلاس کے ان چاروں بچوں پر فخر کرتا ہوں کہ انہوں نے زبانی امتحان کے ساتھ ساتھ اس اخلاقی امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔"

یہ سُنتے ہی ٹکٹ خرید کر چہکنے والے طلبہ کے چہرے پھیکے پڑ گئے۔ وہ دل ہی دل میں پچھتانے لگے۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے پھر کہنا شروع کیا۔

"میرے عزیز بچو... یہ سچ ہے کہ یہ انعامی ٹکٹ ایک قسم کا جوا ہیں۔ بلاشبہ ہمارے یہاں نیک کاموں کے لیے یہ رقم حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ عام لوگ اب نفع کے بغیر نیکی کرنے پر بھی تیار نہیں ہوتے۔ ان کی اسی فطرت کی وجہ سے موقع پرست فائدہ اُٹھا کر انہیں لوٹتے اور بے وقوف بناتے ہیں۔

یاد رکھیے بغیر محنت کوئی چیز حاصل نہیں ہوتی۔ آپ جو کچھ بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے محنت کریں۔ مسلسل جدوجہد کریں۔ لالچ انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔ مجھے امید ہی نہیں یقین بھی ہے کہ آج کے بعد آپ کسی بھی لالچ اور فریب میں نہیں آئیں گے۔ جن بچوں نے ٹکٹ خریدے ہیں وہ امتحان میں تو فیل ہو گئے۔ مگر ان کی رقم انہیں واپس مل جائے گی۔ وہ دفتر میں آکر اپنی رقم واپس لے لیں۔"

طلبہ کو اپنی رقم تو واپس مل گئی، مگر وہ امتحان میں ناکامی پر بے حد شرمندہ تھے۔ ان کے چہروں کی چمک اور لبوں کی مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اور اپنے ان چار ساتھیوں کو رشک بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ جو ٹکٹ نہ خرید کر کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے۔

ایک کنجوس آقا نے اپنے نوکر سے کہا "تم کس قدر گندے آدمی ہو کبھی نہاتے بھی نہیں۔"

نوکر بولا۔ "حضور جن کے پاس میں پہلے نوکر تھا۔ وہ ڈاکٹر تھے اور کہتے تھے کہ پیٹ بھرنے سے تین گھنٹے بعد نہانا چاہئے۔ لیکن جب سے حضور کی خدمت میں آیا ہوں مجھے ایک بار بھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا میں نہاؤں کیسے۔"

محمد مشتاق..... واہ کینٹ

ننھّی نگارشات

نوخیز قلم کاروں کی مختصر تحریروں سے انتخاب

ایک ضروری بات

ادارہ آنکھ مچولی نے بارہا اپنے لکھنے والوں سے درخواست کی ہے کہ وہ نقل شدہ تحریروں کے بجائے ہمیں اپنی ذاتی تحریریں بھجوائیں۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہوں، لیکن بار بار کی یاد دہانیوں کے باوجود بھی بعض ساتھی ہمیں دوسروں کی تحریریں اپنے نام سے بھجوا دیتے ہیں۔ ایسا کرنا بد دیانتی بھی ہے اور تکلیف دہ عمل بھی۔ نقل شدہ تحریریں بھجوانے کے اس منفی رجحان کو روکنے کے لیے ہم اپنے قارئین ساتھیوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ تمام تحریریں بغور پڑھیں اور اگر چوری کی ہوئی یا نقل شدہ کوئی تحریر دیکھیں تو براہِ کرم فوراً اس کی نشاندہی کریں۔ چوری کی تحریریں بھجوانے والوں کے لیے ہمیں مجبوراً "بلیک بکس" کا ایک سلسلہ شروع کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ گویا ایک چھوٹی سی سزا ہے۔ جو ساتھی بھی ہمیں نقل شدہ تحریر بھجوائے گا ہم اُس کا نام اور پتہ "بلیک بکس" میں شائع کیا کریں گے۔ نہ صرف یہ بلکہ "آنکھ مچولی" میں آئندہ ان کے نام سے کبھی کوئی تحریر شائع نہ ہو سکے گی۔ (بلیک بکس "ننھّی نگارشات کے آخری صفحے پر دیکھیے۔)

چور نہانے کا

مرسلہ:- محمد اکرم سیالوی۔ وکیل والہ

توبہ ہے امّی چھوڑ دو — پانی کے رُخ کو موڑ دو
آنکھوں میں صابن بھر گیا — اُف مر گیا اُف مر گیا
ملتی ہو کتنے زور سے — ڈرتی نہیں ہو شور سے
میرا کلیجہ ہِل گیا — پُورا بدن ہی چھِل گیا
پانی تو کافی پڑ چُکا — اب چھوڑ دو پیچھا مرا
سولہ ہی امّی دن ہوئے — نہلا چکی ہو تم مجھے
پھر آج کیوں پکڑا ابھلا — کس واسطے جکڑا بھلا
کیوں غم اُٹھاؤں روز روز — میں کیوں نہاؤں روز روز

کراچی کا اپنے بچوں سے خطاب

خالد خلیل - بزنس روڈ، کراچی

میں عروس البلاد شہر کراچی ہوں، جی ہاں میں کراچی

ہوں۔ مجھے لوگ منی پاکستان اس لئے کہتے ہیں کہ مجھ پر مختلف قومیں آباد ہیں۔ آج میری آبادی تقریباً ایک کروڑ ہے، لیکن آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے میں صرف ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ میرا پرانا نام کلانچی ہے۔ جب ہمارا پیارا ملک پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو مجھے پاکستان کا پہلا دارالحکومت بننے کا شرف حاصل ہوا۔ پاکستان بننے کے بعد ہندوستان سے مہاجرین کی آمد شروع ہو گئی ان کے علاوہ پاکستان کے دوسرے علاقوں سے لوگ آ کر مجھ پر بسنے لگے۔ ان سب نے مل جل کر مجھے ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا اور آج میرا شمار دنیا کے ترقی یافتہ شہروں میں ہوتا ہے۔۔۔

مجھے شہرِ قائد بھی کہتے ہیں۔ میرے قابلِ ذکر مقامات مزارِ قائداعظم، پورٹ ٹرسٹ، کیماڑی، ساحلِ سمندر، ہل پارک سفاری پارک، کلفٹن، چڑیا گھر، عجائب گھر وغیرہ ہیں۔

میرے ہی سینۂ زمین پر پاکستان کی سب سے اونچی عمارت حبیب بینک پلازہ قائم ہے۔ میں روشنیوں کا شہر ہوں لیکن میرے کئی مسائل ہیں جن کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا ان میں صفائی کا ناقص انتظام نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ آج مجھ پر بسنے والوں کو ٹرانسپورٹ کی قلت کا سامنا ہے۔ لوڈشیڈنگ اور پانی کا بحران بھی میری آبادی کے مسائل کی فہرست میں نمایاں ہیں۔

آج پوری دنیا کے شہروں میں فضائی آلودگی ۳ سے ۵ فیصد سالانہ بڑھ رہی ہے تو سائنسدان پریشان ہو گئے ہیں۔ جبکہ میری فضا ۲۲ سے ۲۵ فیصد سالانہ آلودہ ہو رہی ہے مگر کسی کا دھیان اس طرف نہیں جاتا۔ آج میرے دامن پر بسنے والے ایک کروڑ عوام میں سے ۴۰ ہزار گداگر ہیں۔

ایک دور وہ تھا جب لوگ مجھ پر بسنے والوں کے اتحاد کی مثالیں دیتے تھے پھر پتا نہیں مجھ جیسے خوبصورت شہر کو کس کی نظر لگ گئی۔ مجھ پر کچھ عرصہ پہلے خون کی ہولی کھیلی گئی مسلمان اپنے مسلمان بھائی کو قتل کر رہا تھا۔

اور یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

میرا پہلا نام کلانچی تھا دوسرا کراچی اور آج میرا تیسرا نام بھی وجود میں آ چکا ہے۔ وہ ہے "کرفیو جی" شاہ فیصل شہید کے نام پر رکھی جانے والی کالونی آئے دن کرفیو کی زد میں رہتی ہے۔ لیاقت آباد کا نام ہمارے پیارے لیڈر لیاقت علی خان کے نام پر رکھا گیا مگر وہاں سال کے بیشتر دن کرفیو کا راج رہتا ہے۔ اسی طرح میں کرفیو میں گھرا رہتا ہوں، لیکن مجھ پر بسنے والے، میرے چاہنے والے بلند ہمت کے مالک ہیں۔ وہ ہر ہنگامے کے بعد ہمت سے کام لے کر پھر میری ترقی کے لئے کام کرنے لگتے ہیں۔ دشمنوں کو میرے چاہنے والوں کی یہ یکجہتی نہیں بھاتی۔ چنانچہ وہ ہر دم میرے باشندوں میں فساد ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہی دشمنوں نے میرے سینۂ زمین پر بعض ہولناک کھیل کھیلے۔ ۱۰ جولائی ۸۷ء کی شام میرے قلب صدر پر بڑی چہل پہل تھی۔ اچانک ہی ۶ بج کر ۲۰ منٹ پر میرا سینہ ہولناک دھماکوں سے لرز اٹھا۔ میرا یہ پُررونق حصہ آہوں، چیخوں، سسکیوں اور آنسوؤں کا مسکن بن گیا۔ میرے تمام علاقوں میں خوف اور دکھ کے بادل چھا گئے۔ گلی کوچے ویران ہو گئے۔ سینکڑوں افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ ہزاروں افراد زخمی ہو گئے۔ لیکن پھر بھی میرے اوپر بسنے والوں کے حوصلے ڈگمگائے نہیں ان کی ہمت اور بڑھ گئی۔ جگہ جگہ امدادی کیمپ قائم ہو گئے۔۔۔ ہسپتالوں میں خون دینے والوں کی لائنیں لگ گئیں۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کا خون کس نسل کے آدمی کے جسم میں جائے گا۔

یہ محبت ہر وقت موجود رہے۔ میری ہر گلی، ہر کوچے میں دوستی کے نغمے گونجنے لگیں اور میری فضائیں ایک بار پھر اتحاد کی برکتوں سے مالا مال ہو جائیں۔ سُنا ہے بچوں کی دعائیں اللہ تعالیٰ جلد قبول کرتا ہے، آپ تو بچے ہیں نا تو پھر آپ میرے لئے دعا کریں۔ کریں گے نا؟

عِلم

سلمان نقی، کراچی

سچ تو یہ ہے کہ علم ایک بڑی دولت ہی نہیں بلکہ نعمت اور طاقت بھی ہے۔ علم نہ ہوتا تو انسان، حیوان سب برابر ہوتے۔ اس دولت کو نہ کوئی چُرا سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے۔ علم ایک ایسا خزانہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ نہ کسی کی جاگیر ہے نہ ہی کسی کی ملکیت ہے۔ دنیا کا ہر شخص چاہے وہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ امیر ہو یا غریب سب علم حاصل کر سکتے ہیں صرف لگن کی ضرورت ہے۔

علم دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ دنیا کی تمام ترقی یافتہ قوموں نے علم ہی کی بدولت ترقی کی۔ بحری جہاز۔ ریل ڈار ٹیلی فون، وائرلیس، ایکس رے مشین، دوربین، کیمرہ، ریڈیو اور کمپیوٹر وغیرہ یہ تمام ایجادات علم اور تجربہ ہی کے نتیجے میں بنائی گئی ہیں۔

وہ ملک یا قوم جہاں ناخواندگی کی شرح زیادہ ہے آج وہ پسماندہ ہیں۔ کسی بھی قوم کی کامیابی کی دلیل اُس کی خواندگی کی شرح ہے۔ علم انسان کو حقوق و فرائض کا احساس دلاتا ہے۔ اُس کو مہذب بناتا ہے۔ صداقت و شرافت عطا کرتا ہے۔ یہ ایسا ہتھیار ہے جس سے آپ دشمن کو بے بس کر سکتے ہیں۔ جو شخص تعلیم یافتہ ہوگا اُس کی ہر جگہ عزت کی جاتی ہے۔ اُس کو معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوگا

سچ ہے علم ایک بڑی دولت ہے۔

حضورؐ کی زندگی کا ایک واقعہ

محمد ریاض نثار
فیصل آباد

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب عرب میں خدا کے فضل سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور عرب کے اُن کافروں کا زور ہمیشہ کے لئے ٹوٹ چکا تھا جو مسلمانوں کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔ کفر کا خاتمہ اور اسلامی سلطنت کا قائم ہونا حضرت محمدؐ کا ایک ایسا شاندار کارنامہ تھا۔ جس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس زمانے میں ایک دن حضورؐ مسلمانوں کے قبرستان "جنت البقیع" میں فاتحہ پڑھنے کے لئے تشریف لے گئے۔ واپسی پر آپؐ کو بخار ہو گیا۔ آپؐ کو اندازہ ہو گیا کہ اب ہمارے دُنیا سے رُخصت ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ اسی حالت میں ہمارے رسولؐ مسجد میں تشریف لائے اور صحابہؓ کو جمع کیا اور فرمایا: "ہمیں اندازہ ہو گیا ہے کہ اب ہم زیادہ دیر تک دنیا میں نہ رہیں گے۔ اس لئے ہماری خواہش ہے کہ کسی شخص کا ذرا سا حق بھی ہمارے ذمے نہ رہے۔ اگر ہم نے کسی سے قرض لیا ہو اور وہ ابھی تک ادا نہ ہُوا ہو تو وہ اپنا قرض ہم سے لے لے۔ اگر کسی کو ہماری وجہ سے کسی طرح کی تکلیف پہنچی ہو۔ تو وہ اپنا بدلہ لے سکتا ہے۔"

حضورِ اکرمؐ کی یہ بات سُن کر سب مسلمان رونے لگے۔ اُن میں کون تھا جو یہ سوچ سکتا کہ حضورؐ کے ذمے اُس کا کوئی حق ہے لیکن اچانک ایک صحابیؓ کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: "یارسولؐ اللہ! ایک بار آپؐ جہاد کے لئے جانے والے مجاہدین کی قطاریں دُرست کر رہے تھے کہ آپؐ میرے قریب تشریف لائے اور میری کمر پر قمچی ماری۔ میں چاہتا ہوں کہ آپؐ سے اُس کا بدلہ لوں۔" یہ سُن کر مسلمانوں کی بُری حالت ہو گئی۔ سب حیران تھے کہ اس خُدا کے بندے کو کیا ہو گیا ہے۔ جو یہ اپنے آقاؐ سے بدلہ لینے کی باتیں کر رہا ہے، لیکن ہمارے حضورؐ نے فرمایا: "تم بدلہ لے سکتے ہو۔" صحابیؓ بولے۔

"یارسولؐ اللہ! جس وقت آپؐ نے قمچی ماری تھی تو میرا بدن ننگا تھا۔" اب تو غصّے اور رنج سے مسلمان بے تاب ہو گئے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ذرا بھی ناراضگی کا اظہار نہ کیا۔ فرمایا: "ہم بھی قمیض اُتار دیتے ہیں۔" یہ فرما کر آپؐ نے اپنی قمیض اُتار دی۔ اور وہ صحابیؓ حضورؐ کی طرف بڑھے۔ سارے مسلمان چیخیں مار مار کر رونے لگے۔ ہر شخص محسوس کر رہا تھا کہ غم سے اُس کا دل پھٹ جائے گا۔ حضرت محمدؐ کے مبارک بدن پر قمچی

مارنا تو ایک طرف، وہ تو یہ بھی برداشت نہ کر سکتے تھے کہ کوئی شخص بُری نیت سے حضورؐ کے جسم پر پھُول کی پتّی بھی مارے سب سانس روکے آنسو بھری آنکھوں سے حضورؐ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ صحابی جو قمچی مار کر اپنا بدلہ لینا چاہتے تھے حضورؐ کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ کہ اچانک انہوں نے قمچی ہاتھ سے پھینک دی اور دوڑ کر مُہرِ نبوت کو چُوم لیا۔ پھر وہ سیدھے کھڑے ہوئے اور ادب سے ہاتھ باندھ کر کہنے لگے۔

"یارسول اللہ! میرے ماں باپ حضورؐ پر قربان ہوں میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا تھا کہ حضورؐ کے پاک جسم پر قمچی مارتا۔ میں نے تو یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ میں مُہرِ نبوت پر بوسہ دینا چاہتا تھا۔ میرے دِل میں مُدت سے یہ ارمان تھا اور میرے نزدیک کوئی ایسی ترکیب نہ تھی کہ حضورؐ قمیض اُتارتے اور میں اپنا ارمان پورا کر سکتا۔"

یہ بات سُن کر سب مسلمانوں کے چہرے خوشی سے کھِل گئے۔ اُنھیں یوں معلوم ہُوا جیسے بہت بڑا عذاب اُن کے سروں سے ٹل گیا ہے۔

اچھے بچّو! ہمارے حضورؐ کی پُشت مبارک پر دونوں شانوں کے درمیان تھوڑا سا گوشت اُبھرا ہُوا تھا اور اُس کے اُوپر بال اُگے ہوئے تھے۔ یہ نشانی پیدائشی تھی اور اس کو مُہرِ نبوت کہا جاتا ہے۔

عقل مند بادشاہ

مرسلہ:۔ آصف احمد ۔ کراچی

اسکول میں اگلی جمعرات کو سالانہ جلسہ ہو رہا ہے۔ ہمارے دوست اور کلاس فیلو عظیم نے ہمیں خوشخبری سنائی۔

"اچھا! پھر تو بہت لُطف رہے گا۔ ہم ضرور جائیں گے جلسے میں" ہم نے جواب دیا۔

"لیکن میں کچھ اور ہی سوچ رہا ہوں" عظیم سر ہلاتے ہوئے بولا: "دراصل میرے ذہن میں ایک منصوبہ ہے۔"

اُس کی یہ بات سُن کر ہمارا دل دھک سے رہ گیا اور ہمیں اپنے اگلے پچھلے تمام منصوبے یاد آ گئے۔ "گھبراؤ مت، اس منصوبے

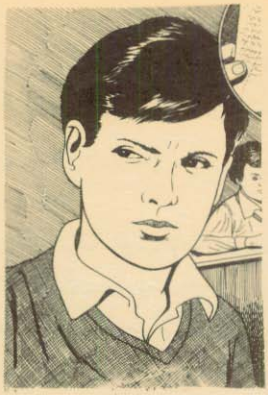

میں نہ تو مار پڑے گی اور نہ ڈانٹ پھٹکار" وہ تسلی دینے کے انداز میں بولا۔

"یہ تو تم ہر منصوبے کے آغاز میں کہتے ہو" ہم نے کہا "مگر یہ منصوبہ ڈرامے میں حصّہ لینے کے بارے میں ہے۔" وہ بولا "کیا؟ ڈرامہ؟" ہم حیرت سے اُچھل پڑے۔

"ہاں ہاں ڈراما" وہ فخر سے بولا "اس کے لئے میں نے کہانی بھی سوچ لی ہے۔"

"سچ سچ بتانا کس رسالے سے چرائی ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"تم مجھے کیا سمجھتے ہو؟ میں کہانی نہیں لکھ سکتا" اُس نے غصّے سے کہا۔

"خیر چھوڑو اس قصّے کو یہ بتاؤ کیا میں بھی اس ڈرامے میں کام کروں گا؟" ہم نے پوچھا۔

"کیوں نہیں ضرور کرو گے۔"

"منصوبہ تو بہت اچھا ہے، بلکہ یہ ہمارا واحد منصوبہ ہے جس میں مار پڑنے کی بجائے انعام ملنے کی توقع ہے۔" ہم بولے۔

"ہاں اور کیا اسکول میں ہماری شہرت الگ ہو گی۔ بولو منظور ہے" وہ ہاتھ پھیلا کر بولا۔ ہم نے اُس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بولے "منظور ہے۔"

اس طرح یہ ہمارا منصوبہ طے پا گیا۔ ہم نے اپنے دوستوں کو بھی اس منصوبے سے آگاہ کیا اور جس لڑکے نے بھی ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش ظاہر کی عظیم نے ڈرامے میں اُس کے

لئے ایک کردار بڑھا دیا۔

آخر خدا خدا کر کے وہ دن آن پہنچا جس کا سب کو انتظار تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا گیا کہ "اب ساتویں جماعت کے طالب علم عظیم اور ان کے ساتھی ایک ڈرامہ پیش کریں گے۔ جس کا نام ہے "عقل مند بادشاہ"۔

پہلا منظر یوں تھا کہ نصیب، بادشاہ سلامت کے دربار میں آنے کا اعلان کرتا ہے اور بادشاہ سلامت بڑی شان سے تشریف لاتے ہیں۔ لیکن ہُوا یہ کہ نصیب نے کافی دیر تک یہ اعلان ہی نہیں کیا۔ آخر تنگ آکر بادشاہ سلامت بغیر اعلان کے ہی دربار میں جانے لگے لیکن ہم نے اُنہیں بڑی مشکل سے روکا اور نصیب کو اعلان کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ اُس وقت جمائیاں لے رہا تھا۔ ہمارا اشارہ دیکھ کر وہ چونک گیا اور بولا "باادب، باملاحظہ، ہوشیار! حضور پُرنور، جہاں پناہ، عالی مرتبت شہنشاہوں کے شہنشاہ تشریف لاتے ہیں"۔ اُس نے "ہیں" کو اتنا لمبا کھینچا کہ یوں معلوم ہونے لگا جیسے سائرن بج رہا ہو۔

بادشاہ سلامت یعنی عظیم اتنے لمبے اعلان سے تنگ آکر چاکلیٹ کھانے میں مصروف ہو گئے تھے۔ ہم نے اُنہیں زور سے دھکا دیا تو وہ لڑکھڑا کر اسٹیج کے درمیان میں جا گرے لیکن جلد ہی کپڑے جھاڑ کر کھڑے ہو گئے۔ اور تماشائیوں کو جھک جھک کر سلام کرنے لگے۔ تماشائیوں کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔

آخر بادشاہ سلامت کے وزیروں نے کھانس کر اپنی طرف متوجہ کیا۔ اور تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ بادشاہ سلامت اتنی زور سے تخت پر بیٹھے کہ وزیر آگے بڑھ کر اس کو تھام نہ لیتے تو پہلے ہی منظر میں بادشاہ سلامت کا تختہ اُلٹ جاتا۔

کہانی کے مطابق اب ہمیں بادشاہ کی عدالت میں فریاد کرنا تھی۔ لہٰذا ہم نے سپاہی کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے مکالمے بولے۔ اُسے یہ کہنا تھا: "بادشاہ سلامت ایک فریادی ایک

اپنی نگارشات صاف، خوشخط، کاغذ کے ایک جانب ایک سطر چھوڑ کر لکھیں۔

ظالم کے ظلم کی داستان سنانے آپ کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے"۔ ہمارا اشارہ پاتے ہی سپاہی تیر کی طرح بادشاہ کے پاس پہنچا اور بغیر سلام و دُعا کے اونچی آواز میں بولا: "بادشاہ سلامت! ایک فریادی آپ کے ظلم کی داستان سُنانے آپ کے دربار میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے"۔

بادشاہ سلامت آنکھیں پھاڑ کر بولے "کیا؟"

اب سپاہی کو احساس ہُوا کہ اُس نے مکالموں میں گڑبڑ کر دی ہے۔ اُس نے گھبرا کر دوبارہ مکالمہ بولنا چاہا، لیکن ہم اُس وقت بادشاہ سلامت کے سامنے پہنچ چکے تھے ہمیں بادشاہ سلامت کو جھک کر سات سلام کرنا تھے۔ ہم نے سلام گننا شروع کئے۔ لیکن چھ پر پہنچ کر گنتی بھول گئے۔ لہٰذا دوبارہ گنتی شروع کی۔ چونکہ اتنے بڑے مجمعے کو دیکھ کر ہم گھبرا گئے تھے۔ اس لئے دوبارہ گنتی میں گڑبڑ ہو گئی۔ اس طرح ہم کوئی پندرہ بیس دفعہ سلام کر چکے تو وقار نے کھانس کر ہمیں ٹوکا۔ ہم گھبرا کر سیدھے کھڑے ہو گئے اور ایک ایسی زوردار چھینک ماری کہ ہماری نقلی مونچھیں اُڑ کر سیدھی بادشاہ سلامت کی گود میں جا گریں۔ بادشاہ سلامت نے کمال مہربانی سے ہمیں مونچھیں واپس کر دیں اور ہم نے جھٹ انھیں لگا دیا۔

تماشائی ہنستے ہنستے دوہرے ہوئے جا رہے تھے۔ کچھ لڑکے سیٹیاں بجانے لگے۔ اور کچھ لڑکوں نے شور مچایا "بکواس ہے۔ بکواس ہے"۔

بادشاہ سلامت نے لڑکوں کو ڈانٹ کر کہا: "شور مت کرو۔ چُپ چاپ ڈرامہ دیکھو۔" پھر ہم سے مخاطب ہو کر بولے "تم کون ہو اور کیا چاہتے ہو؟"

ہم اٹک اٹک کر بولے "حضور... میں ایک غریب... مزدور ہوں اور آپ سے انصاف چاہتا ہوں۔"

بادشاہ سلامت مکالمہ بھول گئے اور گھبرا کر مکالموں کا کاغذ جیب میں ڈھونڈنے لگے۔ آخر وزیر بولا۔

"تم پر کس نے ظلم کیا ہے فریادی؟"

بادشاہ نے سر ہلا کر کہا "ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بولو فریادی تم پر کس نے ظلم کیا ہے۔؟"

"آپ کے کوتوال نے، حضور!" ہم بولے "اس نے مجھ سے کام کروانے کے بعد مزدوری ادا نہیں کی۔"

یہاں بادشاہ سلامت کو چاہئے تھا کہ وہ سپاہیوں کو حکم دیتے کہ وہ کوتوال کو گرفتار کر کے لے آئیں۔ لیکن کوتوال بہت دیر سے اسٹیج پر آنے کے لئے بے چین تھا۔ اپنا نام سنتے ہی اُٹھ کر بادشاہ سلامت کی طرف بھاگا لیکن اسٹیج پر بچھی ہوئی دری کے پھٹے ہوئے حصّے میں اُس کا پیر پھنس گیا۔ اور وہ دھڑام سے بادشاہ سلامت کے قدموں میں جا گرا۔ بادشاہ سلامت پہلے تو اُسے جھک کر دیکھتے رہے۔ پھر بولے۔

"یہ کیا چیز ہے؟"

وزیر وقار نے جواب دیا: "یہ کوتوال ہے جہاں پناہ!"

کوتوال بڑی مشکل سے کھڑا ہُوا تو جہاں پناہ گرج دار آواز میں بولے "تم نے اُس کی مزدوری کیوں ادا نہیں کی؟"

کوتوال بوکھلاہٹ میں مکالمے بھول گیا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ ہکلا کر بولا: "جی۔ جی۔ جی وہ"

بادشاہ سلامت غصّے سے بولے "کیا جی جی کا پہاڑا پڑھ رہے ہو احمق؟"

جواب دو تم نے اُس کی مزدوری کیوں ادا نہیں کی؟

اعجاز سرگوشی میں بولا: "میں مکالمے بھول گیا ہوں۔" لیکن یہ آواز مائکروفون تک پہنچ گئی اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے سب نے سُن لی۔ لوگ ہنس پڑے۔ اب تو بادشاہ سلامت سچ مچ غصّے میں آ گئے۔ پیر پٹخ کر بولے۔

"ایک ہفتے میں تم سے ایک مکالمہ یاد نہ ہو سکا؟ زبانی نہیں بول سکتے تو جیب میں سے کاغذ نکال لو۔ اس میں سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ احمق کہیں کا۔"

لوگوں کو ہنسی ضبط کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ یہ دیکھ کر ہم سے برداشت نہ ہو سکا۔

ہم بادشاہ سلامت یعنی عظیم سے بولے "آخر یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"تم چُپ رہو غریب مزدور۔" بادشاہ سلامت نے غصّے سے جواب دیا۔

یہ سُن کر ہمیں بھی غصّہ آ گیا اور ہم بُرا مان کر واپس جانے لگے۔ لیکن وقار ہمیں روک کر بولا: "کہاں جا رہے ہو؟ ابھی ڈرامہ ختم نہیں ہوا۔"

"تم خود ہی کرو ڈرامہ۔ میں جا رہا ہوں۔" ہم پھٹ پڑے۔

کوتوال نے لپک کر ہمارا ہاتھ پکڑ لیا اور ہم ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگانے لگے۔ کوتوال کے ساتھ سپاہی بھی ہمیں کھینچنے لگا۔ ہم نے پورا زور لگایا تو وہ دونوں ہمارے ساتھ ہی گھسٹتے چلے آئے۔ یہ دیکھ کر عظیم گھبرا گیا اور اُس نے پنکھا جھلنے والے کی ٹانگ پکڑ لی لیکن اُس کی کُرسی اُلٹ گئی اور ایک زوردار دھماکا ہوا۔ تمام تماشائی کھڑے ہو گئے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ کوئی سیٹیاں بجا رہا تھا۔ کوئی تالیاں پیٹ رہا تھا کوئی چلّا چلّا کر خدا جانے کیا کیا کہہ رہا تھا۔ غرض عجیب طوفانِ بدتمیزی مچا ہوا تھا۔ اِدھر سٹیج پر بادشاہ سلامت، وزیر، درباری فریادی، سپاہی اور غلام ایک دوسرے کو چیخ چیخ کر ڈرامہ خراب کرنے کا الزام دے رہے تھے۔ آخر کسی نے پردہ گرا دیا گیا۔ اور اس طرح "عقل مند بادشاہ" کا یہ دربار لڑتے جھگڑتے ختم ہو گیا۔

اسی دن کے بعد ہم نے پکّا ارادہ کر لیا کہ اب ہم عظیم کی باتوں میں ہرگز ہرگز نہ آئیں گے۔ کیونکہ ڈرامے کے بعد ہیڈ ماسٹر

صاحب نے اپنے کمرے میں بلا کر ہم سب کو جھاڑ پلائی اور تمام اُستادوں نے باری باری کان کھینچے۔

گڈریا

مرسلہ :- علی عمران ، کراچی

ایران کے کسی گاؤں میں ایک گڈریا رہتا تھا جو اپنی غریبانہ زندگی پر بہت خوش تھا۔ سارا دن بھیڑیں چراتا اور رات کو گھاس پھونس کی جھونپڑی میں آرام کی نیند سوتا۔ اس گڈریے میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ دوسروں کی تکلیف دیکھ کر اپنے آرام کو بھول جاتا تھا وہ اپنی اس ہمدردی اور محبت کی وجہ سے شہرت رکھتا تھا۔ لوگ اس کے خلوص اور دانشمندی کو دیکھ کر مختلف معاملات میں صلاح و مشورہ کرنے کے لئے آنے لگے۔

یہ بات جب بادشاہ تک پہنچی تو اُسے بھی گڈریئے سے ملنے کا شوق ہُوا۔ آخر ایک دن بادشاہ ایک گڈریئے کے روپ میں اُس سے ملنے آیا۔ وہ بادشاہ سے بے انتہا خوش اخلاقی سے پیش آیا اور اپنی روکھی سوکھی روٹی میں اُسے بھی شامل کر لیا۔ بادشاہ نے رات گڈریئے کی جھونپڑی میں گزاری اور اُس کی دانشمندی کی باتیں سُنتا رہا۔ دوسرے دن صبح بادشاہ نے گڈریئے کا شکریہ ادا کیا اور جانے کی اجازت طلب کی۔ رخصت کے وقت گڈریئے نے بادشاہ سے کہا "آپ گڈریئے نہیں بادشاہ ہیں" بادشاہ حیران ہُوا۔ اور اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے گڈریئے کی عقلمندی سے متاثر ہو کر اُسے آس پاس کے علاقے کا حاکم مقرر کر دیا۔ گڈریا اپنی عقلمندی کی وجہ سے آہستہ آہستہ ایران کے ایک بڑے صوبے کا حاکم بن گیا۔ اُس کی اس عزت اور شہرت کو دیکھ کر دربار کے دوسرے امیروں اور وزیروں کو حسد نے گھیر لیا اور انہوں نے گڈریئے کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور بادشاہ کے کان بھرنے لگے۔ ایک روز انہوں نے بادشاہ سے کہا۔

"گڈریئے حاکم کے پاس ایک فولادی صندوق ہے جسے وہ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا ہے اور اس فولادی صندوق میں بہت بڑا خزانہ ہے :

اس شکایت پر بادشاہ گڈریئے حاکم سے بدظن ہو گیا اور جاسوسوں کو تصدیق کے لئے بھیجا۔ انہوں نے آکر تصدیق کی کہ امیر کی بات درست ہے۔ یہ سُنتے ہی بادشاہ نے گڈریئے حاکم کو شاہی فرمان بھیجا کہ۔

" اپنے فولادی صندوق کے ساتھ فوراً حاضر ہو جاؤ "

فرمان ملتے ہی گڈریا پہنچ گیا۔ بادشاہ نے گڈریئے حاکم پر چوری اور لوٹ مار کے الزامات لگا کر قتل کرانے کی دھمکی دی اور کہا۔

" تم اپنے صندوق میں خزانہ چھپائے پھرتے ہو "

گڈریئے حاکم نے عرض کیا۔

" میں چاہے قتل ہو جاؤں لیکن صندوق کو اپنے سے جُدا نہ کروں گا "

بادشاہ کے حُکم پر صندوق دربار میں کھولا گیا تو اُس میں سے گڈریئے کے اُس زمانے کے کپڑے ملے جب وہ بکریاں چراتا تھا۔ صندوق میں سے اُس زمانے کی ایک بانسری بھی نکلی۔ گڈریئے نے دربار میں ہی اپنا پھٹا پُرانا لباس پہنا اور امیرانہ لباس اُتار کر بادشاہ کو دیتے ہوئے بولا۔

" بادشاہ سلامت ! میں نے کئی سال ان پھٹے پُرانے کپڑوں اور بانسری کو سنبھال کر رکھا تاکہ ان چیزوں کو دیکھ کر خلوص اور صداقت کی خصلتوں کو بھول نہ جاؤں۔ جو شاید بادشاہوں کے دربار میں کم پائی جاتی ہیں۔ جب آپ نے میری سچائی کی قدر نہ کی اور قتل پر آمادہ ہو گئے۔ تب مجھے علم ہُوا کہ جو راحت گڈریئے کی غریبانہ زندگی میں تھی اس امیرانہ زندگی میں نہیں مل سکتی۔ جن درباروں میں حسد اور شکایتیں کامیاب ہوں۔ وہاں ایمانداری کا صلہ قتل کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اب آپ مجھے اجازت دیں تاکہ میں واپس جنگل میں جا کر پھر گڈریا بن جاؤں "

یہ کہہ کر اُس نے بادشاہ کو سلام کیا اور بانسری بجاتا ہوا دربار سے نکل گیا۔ بادشاہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اُس نے ایک نظر دربار میں موجود امیروں وزیروں پر ڈالی۔ جن میں کسی میں گڈریئے جیسی سچائی اور خلوص نہ تھا!

ڈرامہ

سامیہ قیصر ڈار، سیالکوٹ

کردار :۔

عطیہ :۔ ایک نوجوان لڑکی

روبینہ :۔ عطیہ کی ہم عمر سہیلی

چچا جان :۔ عطیہ کے چچا

احمد :۔ عطیہ کا بہرہ چچا زاد بھائی

رمضانی ۔ احمد کا توتلا نوکر ۔

(پردہ اُٹھتا ہے ۔ سامنے چند کرسیاں اور تپائیاں رکھی ہیں ۔ ایک طرف عطیہ اور روبینہ صوفے پر بیٹھی ہیں ۔ عطیہ کے چچا اندر آتے ہیں ۔ دونوں ادب سے کھڑی ہوجاتی ہیں ۔

عطیہ :۔ آداب چچا جان !

روبینہ ، آداب !

چچا جان ۔ جیتی رہو ۔ بیٹھو مجھے تو ایک بہت ضروری کام سے جانا ہے ۔ تم لوگ احمد کے ساتھ گپ شپ کرنا وہ ابھی آتا ہی ہوگا ۔

عطیہ :۔ خدا حافظ

روبینہ :۔ خدا حافظ

(تھوڑی دیر بعد احمد داخل ہوتا ہے)

احمد :۔ اسلام علیکم ۔ بہت دنوں بعد شکل دکھائی ہے ۔ یہ تمہارے ساتھ کون صاحبہ ہیں ۔

عطیہ :۔ یہ میری سہیلی روبینہ ہے ۔

احمد :۔ رونا ۔ ارے ! ارے ! اس میں رونے کی کیا بات ہے

عطیہ :۔ (بلند آواز میں) رونا نہیں روبینہ ، روبینہ

احمد : اچھا اچھا !

عطیہ :۔ فرزانہ کہاں ہے ؟

احمد :۔ دستانہ ! اچھا تو تمہیں یاد ہے میرا دستانہ کھو گیا تھا ارے بھئی مل گیا تھا ۔ تکیے کے نیچے رکھا تھا ۔

عطیہ :۔ (بلند آواز میں) دستانہ نہیں ۔ فرزانہ ، فرزانہ کہاں ہے ۔

احمد :۔ نذرانہ ! وہ تو کل میں مزار پر جاکر دے آیا تھا ۔

عطیہ ، (بہت زیادہ زور سے بولتی ہے) ارے بھئی ! فرزانہ کدھر ہے ۔

احمد :۔ کمال ہے ! پہلے عجیب عجیب باتیں کیوں پوچھ رہی تھی سیدھے سے کہتی فرزانہ کدھر ہے !

عطیہ :۔ اچھا رمضانی کہاں ہے !

احمد :۔ نانی ! نانی جان تو ہمارے گھر نہیں آئیں ۔

عطیہ :۔ (زور سے) رمضانی ، رمضانی ، رمضانی ۔

احمد :۔ رانی ! تم ابھی تک راجہ رانی کی کہانی پڑھتی ہو شرم نہیں آتی ۔

(روبینہ اور عطیہ سر پکڑ کر زور زور سے ہنسنے لگتی ہیں)

احمد :۔ "یہاں دانتوں کی نمائش نہیں ہو رہی ہے"

عطیہ :۔ (غصّے میں ہنستے ہوئے) میں پوچھتی ہوں رمضانی کہاں ہے ؟ (رمضانی آواز سُن کر اندر آتا ہے)

رمضانی :۔ جی بی بی دی (جی) ۔

عطیہ :۔ تین گلاس جوس لانا ۔

رمضانی :۔ اتھا دی ۔

عطیہ :۔ پڑھائی کیسی چل رہی ہے ؟

احمد :۔ شرم کرو میں کوئی لڑکی ہوں جو میں کڑھائی کروں ۔

عطیہ :۔ (زور سے) پڑھائی کیسی چل رہی ہے ؟

احمد :۔ اچھی جا رہی ہے ! تم بتاؤ تمہاری کیسی چل رہی ہے !

عطیہ :۔ میری تو چھٹیاں ہیں ؟

احمد :۔ (حیران ہوکر) چٹکیاں ؟ ارے تمہیں بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی ۔ یہ بات ہے تو پھر میں چلا (باہر بھاگ جاتا ہے)

روبینہ :- عطیہ یہ گھر ہے یا عجائب خانہ۔ نوکر تو تلا، مالک کے بیٹے اونچا سنتے ہیں۔

عطیہ :- (فوراً بات کاٹ کر بولتی ہے) گھر کی مالکن یعنی احمد کی امّی جب منہ میں پان رکھتی ہیں تو پھر وہ شروع ہوتی ہیں کہ بس انہیں چپ کرانا مشکل ہو جاتا ہے۔ احمد کی بہن فرزانہ سارا دن سوتی ہے۔ ایک بہن جو چوہوں اور چھپکلیوں سے ڈرتی ہے انہیں دیکھ کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔

روبینہ :- (فوراً کہتی ہے) عطیہ یہاں سے فوراً چلو نہیں تو میں بے ہوش ضرور ہو جاؤں گی۔

عطیہ :- چلو چلو۔

(پردہ گر جاتا ہے)

میری ڈائری

سمیع الحق قائم خانی جھڈو

ڈائری میری خوبصورت ہے
شوق سے دیکھیے اجازت ہے

سالِ نو کا یہ خاص تحفہ ہے
عام لوگوں میں اس کا چرچا ہے

اس میں موجود ہر مہینہ ہے
سال بھر کے لیے خزینہ ہے

وقت کی قدر یہ سکھاتی ہے
جو بھی پوچھو وہی بتاتی ہے

اس میں تہوار درج ہیں سارے
جس طرح آسمان پر تارے

اس میں لکھتا ہوں روز کے حالات
اور ہر یاد رکھنے والی بات

یہ گلستاں ہے علم و حکمت کا
کیا ٹھکانا ہے اس کی عظمت کا

دیکھنے سے سُرور ملتا ہے
دل کا غنچہ ضرور کھلتا ہے

قومی جھنڈا

حمید یٰسین۔ ملتان

جھنڈے کا رواج بہت پُرانا ہے کہتے ہیں آج سے پانچ ہزار سال پہلے ایران اور اسیریا نے جھنڈے ایجاد کئے تھے۔ (اسیریا کی سلطنت اس مقام پر تھی جہاں اب عراق ہے) پُرانے زمانے میں جھنڈا سب سے بہادر اور طاقت ور سپاہی کے ہاتھ میں دیا جاتا تھا۔ اگر وہ مر جاتا تو دوسرا اُس کی جگہ لے لیتا۔ وہ مارا جاتا تو تیسرا آجاتا۔

اس زمانے میں دُنیا کا سب سے پُرانا جھنڈا ڈنمارک کا ہے جو ۱۲۱۸ء میں بنایا گیا تھا۔ ہر مُلک کا جھنڈا الگ الگ ہے۔ ہمارے جھنڈے میں رنگ ہیں، ہرا اور سفید، ہرا رنگ مسلمانوں کی آبادی کو ظاہر کرتا ہے اور سفید رنگ دوسرے مذہب کے لوگوں کو۔

نقل شدہ، طویل
اور غیر معیاری تحریریں
شائع نہ ہوسکیں گی۔

قومی جھنڈے کی عزت کرنا ہر شخص کا فرض ہے۔ کسی جگہ جھنڈا لہرایا جائے تو ادب سے کھڑے ہو جانا چاہیے۔

"گلیلیو"

محمد راحیل عبید۔ ناظم آباد کراچی

گلیلیو گیلیلی اٹلی کے ایک شہر پیسا میں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک مالدار تاجر تھا، اس لیے گلیلیو نے اچھی تعلیم پائی۔

گلیلیو جب بڑا ہوا تو اپنے شہر کے مدرسے میں مُدرّس ہو گیا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جب تک کسی بات کی سچائی عقل کی کسوٹی پر نہ پرکھی جائے اُس وقت تک اس کو نہیں ماننا چاہیے۔ چنانچہ اُس نے یونان کے فلسفی ارسطو کے اس نظریے کی مخالفت کی کہ اگر مختلف قسم کی دو چیزیں ایک ساتھ نیچے گرائی جائیں تو وہ اپنے وزن کے اعتبار سے جلد اور دیر میں گریں گی۔

گلیلیو کے مخالف نے اس پر الزام لگایا کہ یہ بات کہہ کر اُس نے بزرگوں کی توہین کی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُسے ملازمت سے علیٰحدہ کر دیا گیا۔ لیکن اُس کے دوستوں نے اُس سے کہیں زیادہ تنخواہ پر اسے شہر پیدور میں ملازم کرا دیا۔ یہیں اس کو پرشی کی دریافت کا حال معلوم ہُوا۔

گلیلیو نے جست کی ایک نلکی اور عینک کے دو شیشے لیے ان شیشوں کا ایک رُخ ہموار اور دوسرا کھوکھلا اور اُبھرا ہوا تھا۔ ان دونوں شیشوں کو مناسب جگہ پر قائم کر کے اس نے ایک آلہ بنایا جس سے تین گنا فاصلے کی چیزیں بہت صفائی سے نظر آنے لگیں۔ اس آلے کا نام دُوربین تھا۔

دوربین کے ذریعے گلیلیو نے ایسے ستارے معلوم کیے جو نظر نہ آتے تھے۔

کہکشاں میں اُسے بے شمار چھوٹے چھوٹے ستارے گروہ در گروہ نظر آئے۔ گلیلیو نے رفتہ رفتہ دُوربین کی طاقت بڑھائی اور اس کے ذریعے اس نے چاند کا مشاہدہ کیا۔ چاند میں اُسے پہاڑ، خندقیں اور جنگل دکھائی دیے۔ زہرہ کو دیکھنے پر اس کے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے سیارے گھومتے نظر آئے۔ اُس نے سورج میں بھی متعدد نئی باتیں دریافت کیں۔

لیکن قدیم خیال کے لوگ اس کے سخت خلاف ہو گئے۔ اور انھوں نے اس آلے کو دیکھنا

بھی گناہ سمجھا۔ اب گلیلیو نے کہا کہ سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس پر لوگ اس کے سخت خلاف ہو گئے۔۔۔ انھوں نے پاپائے روم کو بھڑکایا کہ گلیلیو بائیبل کو جھٹلاتا ہے۔ آخر اُسے عدالت میں پیش ہونا پڑا ججوں میں ایک بھی سائنس سے واقف نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہُوا کہ اُنہوں نے گلیلیو سے ایسے خیالات ترک کر دینے کو کہا اور دھمکی دی کہ اگر وہ ان خیالات سے باز نہ آیا تو اُسے قید خانے میں ڈال دیا جائے گا۔ قید کی سختیوں سے خوفزدہ ہو کر گلیلیو نے اپنے خیالات کو چھوڑ دینا منظور کر لیا۔ لیکن وہ اس فیصلے پر زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکا۔ آخر ستر برس کی عمر میں اُسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جیل میں رہنے سے اُس کی صحت جواب دے گئی۔ اور ۷۸ سال کی عمر میں ہی وہ اس دنیا سے چل بسا۔ مگر اس کا نام دنیا میں باقی رہ گیا۔ شہر فلورنس میں آج بھی اُس کا مجسمہ نصب ہے۔

اقوالِ زرّیں

رابعہ بصری کھتری، کراچی

۱۔ بیمار کی عیادت کرو، بھوکے کو کھانا کھلاؤ۔
(حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم)

۲۔ آزادی کی حفاظت نہ کرنے والا غلامی میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ (حضرت علیؓ)

۳۔ حسد اور لالچ کرنے والا کبھی چین نہیں پاتا
(حضرت رابعہ بصریؒ)

۴۔ خاموشی بے فائدہ گفتگو سے بہتر ہے۔
(ابنِ خلدون)

۵۔ کسی کا دل نہ دکھاؤ کہ تم بھی دل رکھتے ہو۔
(ٹالسٹائی)

ہمّت

صائمہ محمود، لاہور

روشن روشن پیارے پیارے
نیل گگن پر نکلے تارے
دُور تلک گو بکھرے ہیں یہ
لیکن پھر بھی نکھرے ہیں یہ

اندھیارے کو دُور بھگائیں
راہ مسافر کو دکھلائیں
چھوٹے ہیں پر کام بڑا ہے
جگ میں ان کا نام بڑا ہے

تم بھی اپنے پیارے بچو
قوم کی آنکھ تارے بچو
یہ نہ سمجھو تم چھوٹے ہو
کام نہیں کچھ کر سکتے ہو

ہمت گر اپنا ؤ گے تم
کام بڑے کر جاؤ گے تم

معلوماتِ عامہ

فہد قیس و ز، حیدرآباد

۱۔ پاکستان کا سب سے بڑا دریا "دریائے سندھ" ہے۔

۲۔ پاکستان کی سب سے بڑی لائبریری "پنجاب لائبریری" ہے۔

۳۔ پاکستان کا سب سے لمبا بیراج "سکھر بیراج" ہے۔

۴۔ پاکستان کا سب سے بڑا فوجی اعزاز "نشانِ حیدر" ہے۔

۵۔ پاکستان کا سب سے بڑا بند "تربیلا بند" ہے۔

۶۔ پاکستان کا سب سے بڑا میوزیم "نیشنل میوزیم کراچی" ہے۔

۷۔ پاکستان کی سب سے بڑی بندرگاہ کراچی کی ہے۔

۸۔ پاکستان کی سب سے بڑی نمک کی کان کھیوڑہ میں ہے۔

۹۔ پاکستان کا سب سے بڑا جنگل "چھانگا مانگا" ہے۔

۱۰۔ پاکستان کی سب سے بڑی صنعت سوتی کپڑے کی ہے۔

۱۱۔ پاکستان کی سب سے بڑی چارپائی ڈیرہ غازی خاں میں ہے۔

۱۲۔ پاکستان کی سب سے طویل ریلوے لائن "کراچی تا پشاور" ہے۔

۱۳۔ پاکستان کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ کراچی کا ہے۔

۱۴۔ پاکستان کا سب سے طویل پلیٹ فارم روہڑی کا ہے۔

۱۵۔ پاکستان کی سب سے بڑی مسجد شاہ فیصل مسجد ہے۔

۱۶۔ پاکستان کا سب سے اونچا پہاڑ (کے ٹو) ہے۔

۱۷۔ پاکستان کی سب سے بڑی جھیل "منچھر جھیل" ہے

۱۸۔ پاکستان کا سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن "لاہور" کا ہے۔

۱۹۔ پاکستان کی سب سے بڑی کوئلے کی کان کوئٹہ میں ہے۔

دوڑ کا مقابلہ

یقیناً آپ اس بات پر حیران ہوں گے کہ

۱۹۰۸ء میں ایک کار اور ہوائی جہاز کے درمیان دوڑ کا مقابلہ ہوا۔ اور یہ دوڑ کار نے جیت لی۔

دُنیا کی چھوٹی جنگ

دنیا کی سب سے چھوٹی جنگ اڑتیس (۳۸) منٹ لڑی گئی

بلیک بکس

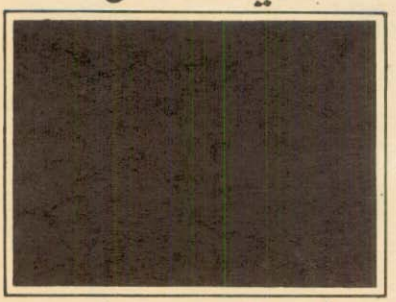

"اگر آپ مستقبل کے اچھے اور نیک نام ادیب بننا چاہتے ہیں تو کوشش کیجیے کہ آپ کا نام بلیک بکس میں نہ آنے پائے۔"

سالگرہ کے ساتھ

فضل ودود صابر ، دہم
یکم فروری ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی ، مطالعہ کرنا
اردو، پشتو، بزنس مین بننا چاہتا ہوں۔
شعیب سنز بکسیلرز او دھیانہ بازار منگورہ سوات

صابر علی آفاق ، بی کام
۳ فروری ۱۹۶۸ء
شاعری، مضمون لکھنا
انگلش ، بینکر۔
۲۹۹ سی۔ ون نمبر ۱۱۔ لطیف آباد، حیدرآباد

حفیظ اللہ ، نہم
۴ فروری ۱۹۷۸ء
آنکھ مچولی پڑھنا، حساب

سرور شاہ ، نہم
یکم فروری ۱۹۷۱ء
قلمی دوستی کرنا، حساب
ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ گجرات پلازہ جامع مسجد روڈ اسلام الدین برف والا، کیماڑی، کراچی

سید ارشاد علی شاہ ، ہفتم
۳ فروری ۱۹۷۷ء
مطالعہ کرنا ، اسکواش
انگلش ، جسٹس سید ابرار علی شاہ
مکان نمبر ۲۹ سیکٹر ایس کورنگی ۱ کراچی

مجاہد حسین باسط ، دہم
۶ فروری ۱۹۷۲ء
مطالعہ کرنا ، اردو

اعظم جمال ، نہم
۲ فروری ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی ، مطالعہ
تاریخ ، انجینئر بنیں گے۔ حیدرآباد لطیف آباد چاندماری روڈ نزد کنونمنٹ بورڈ ہسپتال معرفت عالم ہوٹل

طارق محمود احمد واٹ ، دہم
۳ فروری ۱۹۷۳ء
کرکٹ کھیلنا، ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی، تاریخ اسلام، بزنس مین
کلری احمد شاہ بخاری روڈ۔ انگارہ مسجد گلی بلاک بی مکان نمبر ۳ کراچی

محمد خان ، دہم
۸ فروری ۱۹۷۵ء
کتابوں کا مطالعہ کرنا۔

استاد بن کر قوم کی خدمت کریں گے ۔ معرفت ابوالقاسم کریانہ اسٹور گلی نمبر ۴-۳۶۰ جی، لانڈھی

رشوت شکن پولیس آفیسر گلی نمبر ۷ مکان نمبر ۱۱۳، حسین کالونی، اوکاڑہ

ریاضی، انجینئر محمد خاں ولد محمد یعقوب خان اندرون صدیقہ گیٹ علی پور ضلع مظفر گڑھ

محمد شفیق مخلص، دہم
۱۰ فروری ۱۹۷۳ء
قلمی دوستی، کرکٹ کھیلنا
پنجابی، اسلامیات، آرمی میں جانا چاہتے ہیں۔ چوہدری محمد شریف بمقام آدم پور تحصیل ننکانہ صاحب شیخوپورہ

افتخار احمد، نہم سائنس
۱۲ فروری ۱۹۷۶ء
کرکٹ کھیلنا، قلمی دوستی
بائیالوجی، پائلٹ بننا چاہتے ہیں۔ معرفت ہمدم لائبریری بھٹہ ویلیج کیماڑی، کراچی

عبدالقیوم خدا بخش، ہشتم
۱۲ فروری ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی، آنکھ مچولی، پڑھنا
ایک اچھا انسان باغ کرم علی شاہ نزد امام گاہ سکھر اسلامیہ پرائمری اسکول

سید سلیمان احمد ہشتم اج
۱۲ فروری ۱۹۷۸ء
کرکٹ، ٹکٹ جمع کرنا
انگلش، ڈاکٹر
۴/۱۱ / F ٹیلر توسیع کالونی، کراچی نمبر ۳۱

حافظ اکرم سیال توقیر، دہم
۱۲ فروری ۱۹۶۹ء
ریڈیو کو لکھنا، مطالعہ
اسلامیات، انگلش، معزز شہری، ٹیچر
چاہ سیالاں وکیل والا آدم پور تحصیل ننکانہ صاحب شیخوپورہ

کامران خان، نہم
۱۵ فروری ۱۹۷۵ء
قلمی دوستی، ریاضی،
پائلٹ بنیں گے۔ کامران خان ولد خلیق احمد خان مکان نمبر ۴ چلا ماڈل ٹاؤن رحیم یار خان

وحید گل، نہم
۱۶ فروری ۱۹۷۴ء
قلمی دوستی کرنا، حساب
نیوی آفیسر بنیں گے۔
معرفت نسیم پان شاپ کیماڑی کراچی نمبر ۷

عمران لطیف، ہشتم سی
۱۷ فروری ۱۹۷۹ء
مفید کتابوں کا مطالعہ
سائنس، فوجی افسر بنیں گے۔
مکان نمبر ۷۷، ۵ آئی نائین ون، اسلام آباد

نذر عباس نہم (اے)
۱۸ فروری ۱۹۷۵ء
اخبار اور بچوں کے رسالے پڑھنا، اسلامیات، بہترین انسان
نذر عباس، نیو عباس بکڈپو اردو بازار سرگودھا

شکیل احمد، دہم
۱۹ فروری ۱۹۷۲ء
قلمی دوستی کرنا، انگلش
ڈاکٹر بنیں گے۔ معرفت بھٹہ ویلیج کچھی میانہ مسجد نزد شیخ حسن کمپاؤنڈ، کراچی

صنوبر لعل، دہم
۲۵ فروری
ڈاک ٹکٹ جمع کرنا
اینڈ کرنسی، فزکس، انگلش، کسٹم میں آفیسر
بیمبینو کلاتھ ہاؤس کراچی روڈ خضدار بلوچستان

نوٹ:- ساتھیوں سے گزارش ہے کہ کوپن کے ساتھ جو تصویر ارسال کریں اُس کا سائز ۱،۱ انچ ضرب ڈیڑھ انچ ہو۔

★ اس کالم میں انٹر تک کے طلبہ و طالبات شریک ہو سکتے ہیں ★ کوپن اور تصویر کے بغیر تعارف شائع نہیں کیا جائے گا ★ خراب اور نامکمل کوپن قابلِ قبول نہ ہوں گے ★ طالبات اپنی تصاویر نہ بھیجیں۔

نام ---------- عمر ---------- جماعت ----------
مشاغل ---------- پسندیدہ مضمون ----------
بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہیں ---------- وجہ ----------
پتہ ----------

اُمِّ رمیصاؔ

امّی ابّو کا صفحہ

ہمارے ایک ملنے والے بزرگ نے لاہور سے فون پر اطلاع دی کہ وہ فلاں تاریخ کو کراچی آرہے ہیں۔ اُن کا قیام ہمارے ہاں ہوگا اور یہ کہ "گڑیا بھی اُن کے ساتھ ہوں گی۔

ہم نے مہمانوں کے قیام کے لئے پیشگی انتظامات کے طور پر احتیاطاً بچوں کے کمرے میں بچوں ہی کا ایک چھوٹا پلنگ ڈلوا دیا تاکہ ان کے ہمراہ آنے والی گڑیا بچوں کے ساتھ ہی سوئے۔

مہمان تشریف لائے تو اُن کے ساتھ گڑیا قسم کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ ایک بڑے میاں اور ایک بڑی بی تھیں۔ ہم نے جب "گڑیا" کے نہ آنے کا سبب پوچھا تو بزرگ مہمان نے ایک زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا کہ بھئی "یہ ہماری بیگم ہی تو ہیں جنہیں ہم لوگ گڑیا کہتے ہیں" یہ ساٹھ سالہ گڑیا کو ہم نے پہلی بار حیرت سے دیکھا۔ مہمان بی اماں نے بتایا کہ انہیں بچپن ہی سے گڑیا کہا جاتا ہے۔ اور اب تو یہ نام اس قدر پختہ ہوگیا ہے کہ عزیز دں رشتے داروں کو اُن کا اصل نام یاد ہی نہیں رہا۔

یہ تو محض ایک واقعہ تھا... واقعہ کیا اچھا خاصہ لطیفہ تھا۔

لیکن سچ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کو اُن کے اصل نام کے بجائے "گڑیا، ننھی، پپو، گڈو یا اس قسم کے دیگر ناموں سے بلائے جانے کا رواج عام ہے۔

ایسے ناموں سے بلانے کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ اُن میں سے اکثر بچے بڑے ہونے کے باوجود بڑے نہیں ہو پاتے۔ چونکہ اوائل عمر ہی سے انہیں گڈو، پپو یا گڑیا رانی وغیرہ کے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ اس لئے یہ نام ذہن اور زبان پر ایسے سوار ہوتے ہیں کہ پھر اصل نام پلٹ کر زبان پر آتا ہی نہیں۔ ایسے ناموں سے ایک طرف تو اُن کی شخصیت کا بھرپور اور پُروقار تاثر کبھی نہیں بن پاتا اور دوسری طرف وہ خود بھی اپنی ذات میں بچے ہی رہ جاتے ہیں۔

ایسے لوگ جو بڑی عمر کو پہنچنے کے باوجود بچپن کے ناموں سے پکارے جاتے ہیں، آپ ان کی شخصیت، اُن کی حرکات و سکنات اور ان کی باتوں کا جائزہ لے لیجیے۔ ان میں بچوں کی سی حرکات کم یا زیادہ آپ کو لازماً نظر آئیں گی۔ اپنے مؤقف کے حق میں دلیل کے طور سے میں "منّی باجی" کو پیش کرتی ہوں، جن کی آواز برسہا برس تک ریڈیو پاکستان سے سُنی گئی۔ سُننے والے انہیں بچّہ ہی سمجھتے رہے۔ جب کہ حقیقتاً اُن کی عمر ۷۰، برس سے کیا کم ہوگی۔

یاد رکھئے ناموں اور اُن کے پُکارے جانے کا تعلق نشوونما سے بہت گہرا ہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچّے بڑے ہو کر مکمل طور پر باوقار شخصیت کے مالک بنیں تو اُنہیں اُن کے اُنہی ناموں سے پُکاریئے جو نام اُن کے ہیں۔

یہ گڈو، پپو، بس کبھی کبھار کی حد تک ٹھیک ہے۔

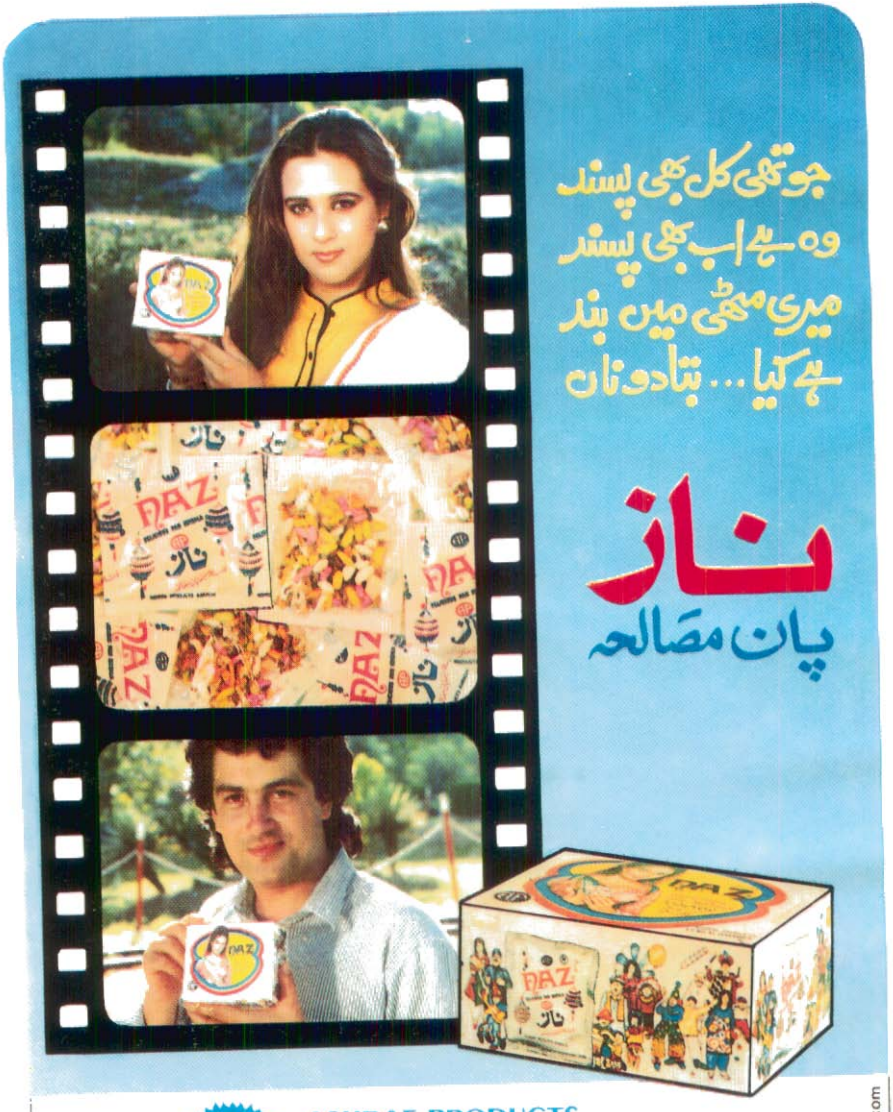

جو تھی کل بھی پسند
وہ ہے اب بھی پسند
میری مٹھی میں بند
ہے کیا... بتادو ناں
ناز
پان مصالحہ
ASHRAF PRODUCTS
P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE
Repcom

LASER DOT